

روحِ عذابِ قبر اور سماجِ موتی

مختلف مکاتبِ فکر کے معترضین کے دلائل کا مکمل و مدلل جائزہ

تصنیف

مولانا عبدالرحمن کیلانی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبۃ السلام، سٹریٹ نمبر ۱۰، پورہ لاہور

روحِ غدا بقبور و سماع موتی

مختلف مکات فکر کے معترضین کے دلائل کا
مُحتمل و مدلل جائزہ

از قلم:

مولانا عبدالرحمن کیلانی

ناشر

مکتبہ السیاحیہ
وسن پورہ
گلی نمبر ۱۲
لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: روح عزاب قبر
مصنف: مولانا عبدالرحمان کیلانی
اشاعت چہارم: مارچ 2005
تعداد: 2200
زیر سرپرستی: ڈاکٹر حبیب الرحمان کیلانی
زیر اہتمام: نجیب الرحمان کیلانی فون: 7844157
ناشر: ڈاکٹر حافظ شفیق الرحمان کیلانی - انجینئر حافظ عتیق الرحمان کیلانی
مطبع: انٹرنیشنل دارالسلام پرنٹنگ پریس لاہور
قیمت: 35 روپے

ناشر: مکتبۃ السلام سٹریٹ نمبر 20، ون پورہ لاہور

فون: 7844157-7280943

دستی بیورو

دارالسلام

کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
ریاض • جدہ • شارجہ • لاہور
لندن • ہیوسٹن • نیو یارک



ہیڈ آفس و مرکزی شو روم 36 - لوزنال، میکزٹریٹ شاہ، لاہور

فون: 711 1023, 711 0081, 723 2400, 724 0024, فیکس: 735 4072

E-mail: darussalampk@hotmail.com Website: www.dar-us-salam.com

شو روم اردو بازار | آفس سٹریٹ مغربی سٹریٹ | اردو بازار لاہور فون: 712 0054 فیکس: 732 0703

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

زیر نظر کتاب ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے مرتب نہیں کی گئی، بلکہ یہ میرے ان پانچ مضامین کا مجموعہ ہے جو پچھلے تین سالوں میں ماہنامہ ترجمان الحدیث اور ماہنامہ محدث میں بالاقساط شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان مضامین کا اصل موضوع وہی تھا جو کتاب کے نام سے واضح ہے۔ اس موضوع کی اہمیت جتنی کچھ ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ مسلمانوں کا کوئی فرقہ یا کوئی طبقہ نہ ہو گا جو اس موضوع سے گہری دلچسپی نہ رکھتا ہو۔ ان مسائل میں کچھ لوگ اگر افراط کی راہ پر چل نکلے اور انتہا کو جانچنے تو کچھ دوسرے تفریط کی طرف مائل ہوتے اور دوسری انتہا تک جانچنے ہیں۔ ان حالات میں یہ مضامین ہر طبقہ میں خاصی دلچسپی سے پڑھے گئے اور اب اسی مقبولیت اور افادیت کے پیش نظر انہیں کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

مختلف اوقات میں چھپنے والے ان مضامین کو یک جا کرنے سے کتاب ہذا میں بعض مقامات پر تکرار واقع ہو گیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اس طرح کے تکرار کو دور کر دیا جائے۔ مگر اس معاملہ میں مجھے کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ اگر ایک مقام پر کسی بات کا اجمالاً ذکر ہوا ہے تو دوسرے مقام پر ذرا تفصیل سے پھر مضمون کی مناسبت بھی اس بات کی متقاضی تھی۔ لہذا اجمال اور تفصیل دونوں اپنے اپنے مقام

پر درست اور ضروری معلوم ہوتے۔ لہذا اسے جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔ پھر اس تکرار کا بھی ایک فائدہ ہے اور وہ یہ کہ بعض ضروری باتیں تکرار کی وجہ سے ذہن میں محفوظ رہ جاتی ہیں۔

اس سلسلہ کی ابتداء یوں ہوئی، جن دنوں وحدت الوجود، وحدت الشہود وغیرہ سے متعلق میرے مضامین ”ترجمان الحدیث“ میں چھپ رہے تھے اور ان میں ضمناً رُوح اور بندوؤں کے مسئلہ تناسخ کا ذکر بھی آ گیا، تو ایک صاحب جناب غلام رسول صاحب نے رُوح اور تناسخ سے متعلق چند سوالات لکھ بھیجے جن کا جواب میں نے ذرا تفصیل سے لکھا اور یہ جواب ”الاستفتاء“ کے عنوان کے تحت ”ترجمان الحدیث“ کی اشاعت ستمبر ۱۹۸۲ء میں چھپا۔ اب اس استفتاء پر مزید دو حضرات (جناب عبدالقادر صاحب سومرو، کراچی اور محمد احسان الحق صاحب، یاروخیل۔ میانوالی) کی طرف سے سوالنامے آئے جن میں ان کے تفصیلی جواب کے متعلق لکھا گیا تھا۔

ان سوالات کے جواب میں میں نے ایک طویل مقالہ لکھا، جو کافی عرصہ بعد ماہنامہ ”محدث“ کی دو قسطوں دسمبر ۱۹۸۳ء اور جنوری ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا خیال یہ تھا کہ یہ طویل مقالہ لکھنے کے بعد شاید مزید استفسارات کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ وجہ یہ تھی کہ ان سوالناموں میں میرے نزدیک سب سے اہم سوال یہ تھا کہ جب قرآن میں صرف دو بار کی موت اور دو بار کی زندگی ہی کا ذکر ہے تو اس عرصہ موت میں برزخ کی زندگی کہاں سے آگئی جو اس قدر مشہور ہے؟ اور اس سوال کا جواب کافی تفصیل سے لکھ دیا گیا تھا۔ اسی ضمن میں عذاب قبر اور سماع موتی کے مسائل بھی زیر بحث آئے۔

اس مقالہ کے رد عمل کے طور پر تین طرح سے اظہار خیال کیا گیا۔ ایک

طبقہ نے کہا کہ امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیمؒ کو خواہ مخواہ صوفیاء کے طبقہ میں شمار کیا گیا ہے اور نیز یہ کہ کتاب الرُوح امام ابن قیمؒ کی اپنی تصنیف ہے ہی نہیں۔ بلکہ کسی دوسرے نے تصنیف کر کے اسے امام ابن قیمؒ سے چسپاں کر دیا ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو اس مقالہ کی روش اعتدال پر اتنا خوش ہوا کہ اس نے تقاضا کیا کہ اس مقالہ کو مپفلٹ کی صورت میں الٹک چھاپ کر شائع کرنا اور عوام میں

مفت تقسیم کرنا چاہیے۔ جبکہ تیسرے طبقہ اس قدر تشدد ہے کہ وہ سماع موٹی کے سلسلہ میں کسی بھی استثنائی صورت کو برداشت نہیں کرتا۔ اور میں نے اس استثنائی صورت کے سلسلہ میں جو چند احادیث صحیحہ پیش کی تھیں، ان میں سے کسی روایت کو تو مجرد یا موضوع ثابت کیا اور جن روایات میں ایسی گنجائش نظر نہ آئی ان کی تاویل کر کے قرآن کریم کے اس واضح ارشاد ”کہ مڑے سن نہیں سکتے“ کے مطابق ڈھال لیا اور استثنائی صورت کو ختم کر دیا۔ اور اس مطابقت کی صورت یہ پیش کی کہ قبر سے مراد یہ زمینی یا مادی یا حتیٰ قبر یا زمینی گڑھا ہے ہی نہیں۔ بلکہ قبر کے حقیقی معنی وہ برزخی قبر ہے جو برزخی زندگی یا مرحلہ ۱۱ میں روجوں کا مستقر ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے تین حضرات کی طرف سے خطوط بھی موصول ہوئے۔ ان میں سے نبی شامی مختصر خط جناب ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب (ص ب ۲۵۵۸۔ مدینہ منورہ) کا ہے، انہوں نے چند حوالوں کے ساتھ میری توجہ اس طرف دلائی ہے کہ میں نے علامہ وحید الزمان کی تصنیف ”لغات الحدیث“ کے حوالہ سے جو حدیث ”حَدُّوا شَطْرَ دِينِكُمْ مِنَ الْحُمَيْرَاءِ“ درج کی تھی۔ وہ موضوع ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب کا مشکور ہوں کہ انہوں نے یہ وضاحت فرمائی۔ تاہم یہ حدیث صرف تائید کے طور پر پیش کی گئی تھی۔ لہذا اس حدیث کے موضوع قرار پانے کے بعد بھی موقف میں فرق نہیں پڑتا۔ علامہ کو کے حوالہ سے ایک ہی حدیث درج کی تھی وہ بھی موضوع نکلی۔ لہذا اسے کتاب ہذا سے خارج کر دیا گیا ہے۔

باقی دو حضرات کے خطوط خاصے طویل تھے۔ اور یہ اس تیسرے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو سماع موٹی کے بارے میں کسی طرح بھی استثناء کے قائل نہیں۔ اس کے بجائے وہ برزخی قبر، برزخی مقام اور برزخی جسم جیسے نظریات کے قائل ہیں۔ ان نظریات کے موجد۔ جہاں تک میرے ناقص علم میں ہے۔ ڈاکٹر کبیر مسعود عثمانی صاحب (توحید روڈ۔ کیماری گراچی) ہیں۔ میں نے اپنے تیسرے مضمون بعنوان ”برزخی قبر اور برزخی جسم سے تعارف“ میں ان دونوں حضرات کے اختلافات، اعتراضات اور اشکالات کے حتیٰ المقدور تفصیل سے جوابات لکھے۔

چوتھا مضمون لکھنے کی وجہ یہ بنی کہ ڈاکٹر عثمانی صاحب موصوف کے ایک
متشدد پیر و کار۔ جناب اشفاق صاحب (ناظم آیا ڈاکر اجی) نے مجھے نہایت
تند و تیز لہجہ میں ایک طویل خط لکھا اور مجھے سخت کسرت کرنے کے ساتھ ساتھ
آخر میں یہ التماس کی گئی تھی کہ میں ڈاکٹر عثمانی صاحب کا بیڑ غائر لٹریچر پڑھ کر
اپنے نظریات پر نظر ثانی کروں۔ لہذا اب میرے لیے ضروری ہو گیا کہ میں ڈاکٹر
عثمانی صاحب کے نظریات اور دلائل کا تجزیہ پیش کروں۔ چنانچہ جو تھا مضمون "ڈاکٹر
عثمانی صاحب کے دلائل کا جائزہ" اسی تہن منظر میں سپرد قلم ہوا اور ساتھ ہی
اشفاق صاحب کا خط بھی بعینہ شائع کر دیا گیا۔ یہ خط اور اس کا جواب دو قسط
میں شائع ہوئے۔

ان حضرات کی خط و کتابت سے فراغت ہوئی تو جناب چوہدری محمد علی
صاحب حنفی کا ایک طویل ترین خط بصورت مضمون موصول ہوا۔ تحریر کا انداز اس
بات کی شہادت دے رہا تھا کہ یہ مضمون چوہدری صاحب کے بجائے کسی ممتاز عالم
دین کا ہی ہو سکتا ہے جنہوں نے چوہدری صاحب کی آڑ لے کر اپنے آپ کو پیش
کیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ تمام تر مضمون نلی سیاہی سے اور رواں دواں شکستہ خط میں
تحریر تھا جبکہ نیچے چوہدری صاحب کے دستخط اور پتہ کالی سیاہی سے، نسبتاً باریک
قلم سے اور ناچختہ خط شکستہ میں ثبت تھے۔ جو کچھ بھی تھا، مجھے تو بہر حال جواب
دینے سے غرض ہے۔ چوہدری صاحب موصوف صرف سماع موٹی پر ہی بس نہیں
کرتے بلکہ اس کے جواز کو بنیاد بنا کر اس سے بعد از مرگ اولیاء اللہ کی کرامات اور
تصرف فی الامور پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ اس خط یا مضمون میں سماع موٹی کے
علی الاطلاق جواز کو قرآن، حدیث، اقوال صحابہ اور بزرگوں کے اقوال سے ثابت
کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور آخر میں یہ استدعا بھی کی گئی ہے کہ میرے اس
خط یا مضمون "سماع موٹی" تصویر کا دوسرا رخ" کو وسعت قلبی سے کام لیتے
ہوئے بحسنہ محدث میں شائع کر دیا جائے اور اس مسئلہ کا فیصلہ قارئین کرام
کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔

اگرچہ یہ خط یا مضمون بہت طویل تھا، تاہم چوہدری صاحب کی خواہش کا

احترام کرتے ہوئے یہ خط پورے کا پورا شائع کر دیا گیا اور میرا جواب اس صورت میں ہے۔ کہ صفحہ میں لائن کے اوپر تو چودھری صاحب کا مضمون مسلسل چل رہا ہے اور لائن کے نیچے حواشی کی طرز پر میرے جوابات مسلسل چلتے ہیں۔ اگر کسی صفحہ پر لائن نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سب مواد چودھری صاحب کا ہے۔ یہ صورت محض اختصار کی خاطر اختیار کی گئی ہے۔ یہ مضمون بعد جوابات محدث کی تین اقساط میں شائع ہوا تھا۔ کتاب نما میں اس پانچویں مضمون کا عنوان "سراج موتی سے تصرفات اولیاء اللہ تک" تجویز کیا گیا ہے۔

ان مضامین کے بالاقساط اور مختلف ادوار میں چھپنے سے یہ فائدہ ضرور ہو گیا ہے کہ میرے بیان سے اختلاف رکھنے والے مختلف مکاتب فکر کے لوگوں کو اختلاف و اعتراض کرنے کا اچھا موقع مل گیا اور اسی طرح مجھے ان حضرات کو جواب دینے کا۔ اس طرح اس موضوع کے تمام تر پہلو سامنے آ گئے، جو ایک مستقل کتاب تالیف کرنے کی صورت میں شاید نہ آسکتے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم مسلمانوں کو قرآن و حدیث کی تاویلات کے بھندے سے بچائے اور شریعت کا سیدھا سادا اور صحیح فہم عطا فرمائے۔ آمین!

عبدالرحمن کیدلانی۔ دارالسلام۔ وسن پور۔ لاہور
شوال ۱۴۰۵ھ مطابق جولائی ۱۹۸۵ء

فہرست مضامین

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۲۹	دوسرے مرحلہ دنیوی زندگی	۳	پیش لفظ
=	استثنائی صورتیں	۸	فہرست مضامین
۳۰	۱۔ اِحیائے موتی۔	۱۲	① الاستقام
۳۱	ب۔ خواب۔	۱۳	الجواب
۳۲	برزخ کا لغوی مفہوم	=	۱۔ امر ربی کا مفہوم
=	برزخی موت یا نیند	۱۴	۲۔ سوال روح کے مسائل؟
=	روح انسانی یا نفس	=	۳۔ روح کی قسمیں
۳۳	روح سے متعلق چند حقائق	۱۶	۴۔ تناسخ یا آواگون
۳۵	تیسرا مرحلہ عرفۃ برزخ	۱۸	روح کا سفر
=	استثنائی صورتیں	=	شہداء کی زندگی
=	۱۔ عذاب قبر	=	سماع موتی
=	عذاب قبر کی حقیقت	۱۹	۵۔ تناسخ اور روح کئی
۳۶	قرآن اور عذاب قبر	۲۱	۶۔ حالت نزع میں رنج و رقت
۳۸	قبر اور حدیث	=	۷۔ بدرؤحیں
۳۹	عذاب قبر کا عقلی ثبوت	=	② روح عذاب قبر اور
۳۹	عذاب قبر روح اور بدن {	۲۳	سماع موتی
	دونوں کو ہے۔	۲۶	الجواب
۴۰	آزمائش اور حساب کا نزع	=	زندگی اور موت کے چار مراحل
۴۲	ب۔ سماع موتی	۲۷	پہلا مرحلہ موت ہے۔
۴۳	استثنائی صورت	=	روحوں کی پیدائش کب ہوتی؟

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۵۸	علامہ وحید الزمانؒ	۴۳	استثنائی صورتوں کے نتائج
۵۹	سماع موثیٰ اور مولانا مودودیؒ	۴۳	سماع موثیٰ کے قائلین کا {
۶۰	سماع موثیٰ کی پشت پناہی		طرز استدلال
۶۲	چوتھا مرحلہ - اخروی زندگی	۴۵	۱۔ قرآنی آیات کی تاویل
۶۲	{ ارواح کی مین المراحل		تاویلات کا جائزہ
	{ پیش رفت اور ارجحیت	۴۶	۲۔ احادیث صحیحہ
	شہداء کی زندگی		۳۔ تیسرے اور چوتھے درجہ کی احادیث
	رُوحوں کی واپسی		۴۔ بزرگوں کے اقوال
۶۳	نگاہِ بازگشت		متکرمین سماع موثیٰ کے دلائل
۶۴	{ بزرخی قبر اور بزرخی		۱۔ قرآن
	{ جسم سے تعارف	۴۷	۲۔ احادیث صحیحہ
	مراسلات (۱)		۱۔ مقتولین بدر
۶۸	مستفسر کے دلائل کا جائزہ	۴۹	حضرت عائشہؓ کا تفقہ
	۱۔ قبر کا اصل مقام	۵۰	۲۔ اہل قبور کو السلام علیکم کہنا
۶۹	۲۔ عذاب قبر کا جسم سے تعلق		۳۔ بچوں کی چاپ سنانا
۷۰	پہلی حدیث	۵۱	۴۔ حضور اکرمؐ پر صلوة و سلام
۷۱	دوسری حدیث	۵۲	سلام تشہد
۷۲	تیسری حدیث	۵۳	موضوع احادیث
	مستفسر کے دلائل کا جواب		نقد و نظر
۷۶	مستفسر کے اشکالات	۵۴	موضوع حدیث ما
	۱۔ قبر کا معنی اور مقام	۵۵	علمائے دین اور سماع موثیٰ
۷۷	۲۔ نقد احادیث	۵۶	جعلی حدیث کے نتائج
۷۹	۳۔ تاویل احادیث	۵۷	کتاب الروح اور سماع موثیٰ
۸۱	ماحصل		امام ابو حنیفہؒ

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۰۸	سماع موتی کے متعلق قول فیصل	۸۳	④ ڈاکٹر عثمانی صاحب کے دلائل کا جائزہ (مراسلات ۲)
۱۰۹	نظریہ برزخی قبر کو مان لینے کا فائدہ اور ضرورت	۸۴	اشفاق صاحب کا غائب نامہ
۱۱۰	⑤ سماع موتی سے تصرفات اولیاء تک	۹۰	جوابات
۱۱۱	مراسلات (۳) سماع موتی تصویر کا دوسرا نسخہ	۹۱	۱۔ مقام قبر؟ برزخی قبر محض ایک نظریہ ہے
۱۱۲	کیا سماع موتی کے قائل مشرک ہیں؟	۹۲	برزخی جسم کیا غیبین اور سچین برزخی
۱۱۳	بزرگوں کی مشترک اور متواتر کوششیں	۹۳	مقام ہیں؟ قبر سے مراد یہی زمینی گڑھا ہے
۱۱۵	پھیلوں کا پہلوں پر لعن طعن ائمہ مشائخ کے اقوال کو حجت	۹۴	شاخوں والی حدیث کا نیا مطلب؟
۱۱۶	سمجھنا انہیں رب بنانے کے مترادف ہے۔	۹۵	برزخی قبر کے نظریہ کا استنباط قبر کے عام مفہوم پر عثمانی صاحب کے اعتراضات
۱۱۷	قرقہ پرستی کی اصل بنیاد برطی تجماعت یا سو دا عظیم کا مفہوم	۹۶	اعتراضات کے جوابات
۱۱۹	سماع موتی پر اجماع اُمت؟ شیخ عبدالحق محدث دہلوی	۱۰۰	شہدار اور عالم برزخ
۱۱۹	اور پیران پیر کی نماز اموات کا احساس و شعور	۱۰۱	۲۔ اعادہ روح اور عذاب قبر قد عرفنا لہو کی عثمانی تشریح
۱۲۰		۱۰۶	اعتراض ۱۔
		۱۰۷	جواب
		۱۰۸	اعتراض ۲۔
		۱۰۸	جواب

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۲۲	قص میں اجتناب نہیں۔	۱۲۱	قرآن سے سماع موثق کے دلائل
۱۲۳	انکار سماع موثق سے {	=	دلیل کا جواب
۱۲۳	حضرت عائشہؓ کا رجوع؟	۱۲۳	وضعی حدیث اور سماع موثق
۱۲۴	باب سماع میں حضرت عائشہؓ	۱۲۴	دوسری وضعی حدیث
=	سے مروی روایات۔	۱۲۵	تیسری وضعی حدیث
=	ابن ابی الدنیا کی روایات	۱۲۶	بزرگوں سے بغض و عناد؟
۱۲۵	حضرت عائشہؓ کا اپنے	۱۲۸	میں دونوں اللہ کی تفسیر؟
۱۲۶	بھائی سے خطاب۔	۱۳۰	معبودانِ باطل اور {
۱۲۶	ابن ابی الدنیا کی ثقاہت؟	۱۳۰	بزرگ ہستیاں
۱۲۷	فوت شدہ بزرگوں سے {	۱۳۳	والتأثرات عرقا کی تفسیر
۱۲۷	عورتوں کا پردہ؟	۱۳۵	ترجمہ میں "نفوس قاضلہ" {
۱۲۷	حیات برزخ اور سماع موثق {	۱۳۵	کے اضافہ کے قواعد
۱۲۸	کیا لازم و عزم ہیں؟	۱۳۶	احادیث رسول اللہ سے {
۱۲۸	سماع موثق یا {	۱۳۶	سماع موثق کا ثبوت
۱۲۸	احترام آدمیت؟	۱۳۸	سماع موثق اور صحابہ کرام
۱۲۹	امام ابو حنیفہؒ سے منسوب روایات	۱۳۹	حدیث صحیح، استنباط غلط
۱۵۰	متکثرین سماع موثق کے امام اعظم	۱۴۰	حضرت عائشہؓ کے انکار {
۱۵۱	معمد گس کے لیے؟	۱۴۰	سماع موثق پر ایک نظر



الإستفتاء

(یہ استفاء ترجمان الحدیث ستمبر ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔)

غلام رسول زبیر قبولہ ضلع ساہیوال سے لکھتے ہیں:
 مکرمی جناب کیلانی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔
 تعریفِ قدا اور توصیفِ خاتم المرسلین۔

آتا بعد: بندہ گورنمنٹ کالج لاہور میں سال دوم کا طالب علم ہے یاہنا ترجمان الحدیث
 میں آپ کے مضامین پڑھنے کے بعد دینی طور پر آپ کے قلمی جہاد اور آپ کی علمی استعداد کا معترف
 ہو گیا ہوں۔ خدا آپ کو ملتِ اسلامیہ کی بھرپور خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!
 گزشتہ شماروں میں موجودہ شماروں تک حالاً آپ کا بصیرت افروز سلسلہ وار مضمون
 نظریہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود شائع ہو رہا ہے جس سے آپ کی علمی لیاقت اور گہرے
 مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔

اس سلسلے میں چند سوالات ذہن میں ابھر رہے ہیں۔ اور مجھے اُمید ہے کہ آپ اپنے
 مخصوص انداز سے ان کا حل بیان فرمائیں گے۔ میں اس عنایت کے لئے شکر گزار ہوں گا۔
 مزید یہ جیسے علم میں اضافہ کا موجب ہوگا۔ براہِ راست جواب کے لیے ممنون ہوں گا۔
 (۱) قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ رُوحِ خدا کے حکم سے ہے۔ کیا رُوح
 خدا کا حکم ہے؟ اور رُوحِ خدا کے حکم سے ہے؟ میں تین فرق نہیں؟

(یہ سوال میں اس لیے کر رہا ہوں کہ بعض کتب میں رُوحِ خدا کا حکم ہے درج ہے۔

جیسے کیا ہے سعادت از امام غزالی) اگر ان میں فرق ہے تو کیا؟ اور اگر نہیں تو کیسے؟

(۲) چونکہ استفسار کرنے والے یہودی تھے۔ اس لیے اگر ہم اس خطاب کو انہی کی طرف تصور کریں کہ تمہیں اس کے بارے میں بہت کم علم دیا گیا ہے، تو مسلمانوں کی بابت کیا سمجھا جائے؟

(۳) علماءِ رُوح کو دو درجوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ جیسے کہ امام غزالیؒ نے انھیں رُوحِ حیوانی اور رُوحِ انسانی کا نام دیا ہے اور علیؑ جو پری نے نفسِ زیریں اور نفسِ بالا کا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس آئیہ مبارکہ میں کونسی رُوح کی طرف اشارہ ہے اور کیوں؟

(۴) کیا ہندوؤں کا نظریہ آداگون اور مشہور شیعہ فرقہ طیارہ کا نظریہ رُوحِ باہمی مطابقت سے مستثنیٰ ہیں؟

(۵) مسلمان فلاسفہ جیسے ابنِ رشد نے بھی رُوحِ کلی کا نظریہ پیش کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ ہر رُوحِ جسم سے جدا ہونے کے بعد رُوحِ کلی میں چلی جاتی ہے۔ کیا اس نظریہ اور ہندوؤں کے نظریہ تنازع کا مرکز حتمہ ایک ہی نہیں؟

(۶) غنیۃ الطالبین میں حدیث مذکور ہے کہ آپؐ فرمایا کہ "نیک رُوح بدن سے یوں باسانی نکلتی ہے جیسے برتن سے پانی نکلتا ہے جبکہ بُری رُوح بدن میں پھیل جاتی ہے اور اس شدت سے کھینچی جاتی ہے کہ تمام جسم درد سے بلبلا اٹھتا ہے۔ (در بابِ آخرت) یہ مفہوم حدیث ہے الفاظ نہیں۔ کیا آپ اس عقیدہ کو صحیح تسلیم کرتے ہیں؟

(۷) رُوح اور بد رُوح میں فرق واضح کریں؟ شکر ہے!

الجواب

۱۔ امرِ ربّی کا مفہوم۔

"رُوحِ خدا کے حکم سے ہے" یا "رُوحِ خدا کا حکم ہے" میں الفاظ کا فرق تو ضرور ہے مگر نتیجتاً مفہوم دونوں کا ایک ہی نکلتا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ
حکم بھی اسی کا چلے گا۔

(۷۴)

اس آیت میں "الْخَلْق" سے مراد تمام مخلوق اور "الْأَمْر" سے مراد تمام قسم کے احکام ہیں

ان تمام احکام میں سے ایک حکم رُوح بھی ہے۔ اب اگر "الامر" کو ایک اکائی تصور کیا جائے تو رُوح اس کا جزو ہوا جیسے کہ ارشاد باری ہے :-

قُلِ اللّٰهُ حَرَمٌ مِّنْ اَمْرٍ رَبِّيْ (۱۸)

اور اگر "الامر" سے مراد تمام احکام لیے جائیں تو رُوح بھی ایک مستقل حکم ہوا۔ لہذا اگر کوئی صاحبِ اُمر سے "رُوح خدا کا حکم ہے" سے تعبیر کریں تو ہمارے خیال میں مفہوم میں کچھ فرق نہیں پڑیگا۔

۲۔ رُوح سے متعلق سوال کرنے والے؟

استفسار کرنے والے بھونڈی یا مشرکین کہتے تھے۔ جنہوں نے یہودیوں ہی کے کہنے پر حضور کریم سے چند سوالات پوچھے۔ انہی میں سے ایک سوال رُوح کے متعلق تھا۔ اللہ تعالیٰ نے رُوح سے متعلق سوال کے جواب میں جو یہ حقیقت بیان فرمائی ہے کہ "تمہیں رُوح کے متعلق بہت کم علم دیا گیا ہے" تو یہ خطاب نہ یہود سے متعلق ہے نہ مشرکین مکہ سے۔ بلکہ اُس کے مخاطب تمام بنی نوع انسان ہیں۔ خواہ وہ مسلم ہوں یا کافر، عالم ہوں یا جاہل، نبی ہوں یا ولی، کیونکہ انسان بن ستنی علمی استعداد و ولایت کی گئی ہے۔ وہ رُوح کی گندہ بھننے سے قاصر و عاجز ہے۔

۳۔ رُوح کی قسمیں۔

رُوح کی دو قسمیں ہیں۔ ایک رُوح حیوانی جس کا تعلق گردشِ خون سے ہے۔ جب تک گردشِ خون برقرار ہے یہ رُوح بھی موجود ہوگی۔ گردشِ رُوح ختم ہو جاتی یا نکل جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر جب تک یہ رُوح موجود ہو گردشِ خون برقرار رہتی ہے۔ اگر یہ رُوح نکل جائے تو گردشِ خون ختم ہو جاتی ہے۔

دوسری قسم رُوحِ نفسانی ہے جسے رُوحِ انسانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ رُوح کی یہ قسم وہ ہے جو اُردنِ خواب سیر کرتی پھرتی ہے۔ رُوح کی یہ قسم یا رُوحِ کاہِ صحتہ جب انسان کے جسم کو چھوڑ دیتا ہے تو انسان کے حواسِ خمسہ کی کارکردگی میں نمایاں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ نیند کے دوران قوتِ باہرہ، لامسہ اور ذائقہ کی کارکردگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں اگر نفلِ نیازہ ہو یا کوئی دوسرا آدمی سوتے ہوئے آدمی کو آواز سے کر جگائے تو یہ رُوحِ نفسانی دوبارہ جسم میں لوٹ آتی ہے۔ ایسی طرح تیز قسم کی خوشبو یا بدبو بھی بسا اوقات انسان کے جاگنے کا سبب بن جاتی ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان دونوں قسم کی رُوحوں کا آپس میں نہایت گہرا اور قوی تعلق ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک ہی اکائی کے دو جزو ہیں۔ رُوحِ نفسانی اگر خواب میں کسی بات یا کسی چیز سے لطف اندوز ہوتی ہے تو انسان جب جاگتا ہے، ہبشاش، ہبشاش نظر آتا ہے۔ اور اگر رُوحِ نفسانی کو خواب

میں کوئی ناگوار مادہ پیش آجائے تو بعض دفعہ انسان سوتے میں ہی چپخنے پلانے لگتا ہے اور جاگتا ہے تو سخت اندوہناک ہوتا ہے۔ اور اگر خواب میں کہیں مار پٹے تو حیرت کی بات یہ ہے کہ اس مار پٹائی کے اثرات اور نشانات بھی بعض دفعہ انسان کے جسم پر نمودار ہو جاتے ہیں جنہیں انسان جاننے کے بعد خود شاہدہ کر سکتا ہے۔

ان ہر دو اقسام کی رُوحوں کے باہمی تعلق کے بارے میں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رکھنی چاہیے کہ ایک قسم کی رُوح کے خاتمہ سے دوسری رُوح خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال یہاں سمجھنے کے ایک شخص سو رہا کرتی خواب دیکھ رہا ہے گئی دوسرے شخص نے اسے سوتے میں قتل کر دیا تو رُوح نفسانی خواہ کہیں بھی سیر کرتی ہوگی۔ یہ اب دوبارہ اس جسم میں داخل نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر دولان خواب اگر رُوح نفسانی کو اللہ تعالیٰ قبض کر لیں تو رُوح حیوانی کی کارگزاری یعنی دولان خون خود بخود ختم ہو جائے گا اور انسان پر موت واقع ہو جائے گی۔ ارشاد باری ہے:

”اللَّهُ يَتَوَكَّلُ عَلَى الْإِنْسَانِ حِينَ مَوْتِهِ
وَالَّذِي لَوْ تَشَاءُ نَفِثْنَا فِي نَسَائِكَ
فَإِنَّهَا لَفَتَنُوكَ الْيَتِيمَ قَعْلَىٰ عَلَيْهَا
النَّمُوتَ ذَرِّبُوكَ الْأَعْيُنَ إِلَىٰ
أَعْيُنٍ مَّمَّعَىٰ“
(الزمر: ۴۲)

”اللہ تعالیٰ مرنے کے وقت ان کی رُوحیں
قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں ان
کی رُوحیں سوتے میں (قبض کر لیتا ہے)
پھر جن پر موت کا حکم کر چکا ہے ان کو
روک رکھتا ہے اور باقی رُوحوں کو ایک
مقررہ وقت کے لیے چھوڑ دیتا ہے؟“

آیت مذکورہ سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

- ۱- یہ آیت اس بات پر سب سے بڑی دلیل ہے کہ رُوح کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم وہ ہے جو ہر دم انسان کے بدن میں موجود رہتی ہے اور دوسری وہ جو خواب میں جسم سے علیحدہ ہو جاتی ہے۔
- ۲- جاگتے میں یہ دونوں قسم کی رُوحیں یا رُوح کے ہر دو جتنا انسان میں موجود رہتے ہیں۔
- ۳- رُوح کو قبض کرنا یا موت دینا صرف اللہ تعالیٰ کے بس میں ہے۔ اگر وہ خواب کے دولان رُوح نفسانی کو قبض کرے تو بھی موت واقع ہو جاتی ہے۔

۴- بیداری کی حالت پر پوری زندگی اور خواب کی حالت نیم زندگی کی کیفیت ہے جس میں کچھ صفات زندگی کی پائی جاتی ہیں اور کچھ موت کی۔ مگر باہر کیفیت موت و حیات کے درمیان برزخی حالت کی مظہر ہوتی ہے۔ جیسا کہ دنیا اور آخرت کی زندگی کے درمیان قبر کی زندگی برزخی زندگی ہوتی

ہے۔ فرق کھینٹ یہ ہے، قبر کی زندگی میں موت کے اثبات غالب ہوتے ہیں۔ اور خواب کی زندگی میں زندگی کے۔ خواب کے دوران چونکہ کچھ خصوصیات موت کی بھی پائی جاتی ہیں اس لیے حضور اکرمؐ نے اسے موت سے تشبیہ دی ہے۔

۴۔ تناسخ یا آواگون۔

تناسخ یا آواگون کا نظریہ خالص ہندوستان فلسفہ جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض متصوفین یا مسلمانوں کے بعض فرقے جو اس عقیدہ کو درست سمجھتے ہیں۔ اور قرآنی آیات سے ثبوت کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے متعلق اس سے زیادہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ باطنیت اور رہبانیت نے جن اسلامی عقائد و نظریات پر بیجا کر کے ان کا علیہ بگاڑا ہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

احادیث صحیحہ میں ایک واقعہ مذکور ہے جسے امام بخاریؒ بھی قرآن کی آیت:
 "وَلَا تُخَذِرُ بَنِي يَوْمَ يَبْتَسُونَ"
 "اور اے اللہ مجھے قیامت کے دن
 رسوا نہ کرنا"
 (۲۶/۸۲)

کے تحت کتاب التفسیر میں لائے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قیامت کے دن حضرت ابراہیمؑ کو رسوا کیا جائے گا۔ تو حضرت ابراہیمؑ اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ "یا اللہ تیرا وعدہ ہے، تو قیامت کے دن مجھے رسوا نہ کرے گا۔ اور میری اس سے زیادہ رسوائی اور کیا ہو سکتی ہے کہ میرا باپ اس طرح رسوا ہو رہا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اپنے پاؤں کے نیچے دیکھئے! اتنی دیر میں آپ کے باپ (آؤد یا تارخ) کی شکل تبدیل کر دی جائے گی۔ آپ دیکھیں گے تو آپ کو نجاست میں نظر آئے گا۔ بچو نظر آئے گا۔ جسے فرشتے دوزخ میں ڈال دیں گے۔ تاکہ کوئی شخص یہ معلوم نہ کر سکے کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کا باپ ہے۔ اس طرح حضرت ابراہیمؑ کو رسوائی سے بچایا جائے گا۔ اور ان کے باپ کو بھی اس کے گناہوں کی تدارق واقعی سزا مل جائے گی۔

اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:-

- ۱۔ قیامت کے روز ارواح کو جو اجسام عطا کیے جائیں گے وہ وہی مانوس انسانی بدن ہوں گے، جنہیں دوسرے رنگ پہچانتے ہوں گے۔
- ۲۔ اگر حضرت ابراہیمؑ کے باپ کو بخراجم دیا گیا تو بعض ایک استثنائی صورت ہے جس کے لیے ایک ٹھوس بنیاد ہے۔

۳- اللہ کا قانون جتنا اونٹنا ستمگم اور ہمہ گیر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ ضعیف اللہ جیسے جلیل القدر پیغمبر اپنے باپ کو بھی عذاب الہی سے بچا نہیں سکیں گے تو کسی دوسرے پیغمبر یا نبی کی کیا مجال ہے کہ وہ قیامت کے روز کسی کی نجات کا دم بھرے۔

اسی طرح قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن کا ایک یہ منظر پیش کیا ہے :

قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قَرِينٌ ۚ
فَقَوْلُ آيَاتِكَ لِيَوْمَ الْمَصْدِقِ ۚ إِذَا

مِنَّا وَرَكْنَا مُرْءَابًا وَقِطَطًا مَاءً ۚ إِنَّا
لَمُبْدِيُونَ ۚ قَالَ هَلْ أَنْتُمْ مُطَّلِعُونَ
فَأَخْلَعُمْ قَدَاهُ فِي سِوَاهِ النَّجْمِ ۚ

کہ جھلا تم بھی (ایسی باتیں) باد کو نہ والوں
میں سے ہو، جھلا جب ہم مگنے اور
مٹی اور بڑیاں ہو گئے تو کیا ہم پر گرفت
ہو کے گی؛ اللہ تعالیٰ اس سے کہے گا کیا

(الصف: ۵۱-۵۵)

تم اس سے باخبر ہونا چاہتے ہو، پھر جب

جہان کے گاتو اس (برے ساتھی) کو درخ کے وسط میں دیکھے گا؟

ان آیات سے بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ نیک بخت انسان بھی اسی مانوس شکل کو ڈھنڈورا ہوگا۔ جو اس نے دنیا میں دیکھی تھی، جو باقیامت کے دن وہی بدن اور وہی شکلیں ارواح کو دی جائیں گی جو اس دنیا میں تھیں۔

اس کے علاوہ اور بہت سی آیات سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لوگ اس دن ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں گے اور یہی صورت میں ممکن ہے جب ارواح کو وہی اجسام اور وہی شکلیں عطا کی جائیں جو دنیا میں تھیں۔

اب دیکھئے نصوص قرآنیہ سے یہ بات ثابت ہے کہ مرنے کے بعد سے لے کر قیامت کے دن تک مومنوں کی ارواح علیین میں اور کافروں کی ارواح سغین میں مقید ہوتی ہیں، ان کو کوئی نیا جسم عطا نہیں کیا جاتا، اور قیامت کے دن جو جسم عطا کیا جائے گا وہی ہوگا جو اس دنیا میں تھا۔ تو بلاشبہ کہ اب جناح کی گنجائش کہاں سے نکل سکتی ہے، جس کی رُو سے مرنے کے بعد رُوح کو کبھی کسی گد سے کا جسم عطا کیا جاتا ہے کبھی کبھی پتھر یا پتو کا اور کبھی گتے اور سوزن وغیرہ کا۔

یہاں ضمناً ایک دو باتیں اور بھی سامنے آئیں۔ جن میں سے ایک تو شہدائے زندگی کے متعلق ہے۔ جن کے متعلق قرآن میں ہے کہ انھیں مردہ مت کہو، وہ مردہ نہیں بلکہ زندہ ہیں۔ اور مدیث

ہیں ہے کہ شہداء کی رُو میں سبز پرندوں کی شکل میں جنت کے باغوں میں چھپائی پھرتی ہیں۔ اور دوسری بات سماعِ موتی سے تعلق رکھتی ہے۔

روح کا سفر:

روح کا سفر اس طرح ہے کہ انسان جب بطنِ مادر میں لوتھڑا کی شکل اختیار کرتا ہے تو اس میں روح داخل کی جاتی ہے۔ پھر وہ بطنِ مادر سے باہر آتا ہے۔ اب یہ بچہ کہلاتا ہے۔ پھر جوان ہوتا ہے۔ پھر بوڑھا ہوتا ہے۔ پھر اس پر موت آتی ہے یعنی قبر کی زندگی یا برزخی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد قیامت کے دن اس طرح کے اجسام ہلکے جائیں گے اور یہ بھی پوری زندگی ہوگی۔

شہداء کی زندگی:

اب دیکھئے زندگی کے اس سفر کی منازل میں شارٹ کٹ تو ہو سکتا ہے لیکن واپسی ناممکن ہے یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایک بچہ جوان ہونے یا بوڑھا ہونے سے پہلے ہی مر جائے یا نیکمِ مادر میں ہی مر جائے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی بوڑھا بچہ بن جائے یا بچہ نیکمِ مادر میں واپس چلا جائے۔ شہداء کی فضیلت یہ ہے کہ ان کی قبر کی زندگی یا برزخی جسے عام اصطلاح میں بھی موت کہا جاتا ہے اور قرآن نے بھی اسے موت ہی سے تعبیر کیا ہے۔ حذف کر دی گئی ہے۔ اور شہید مرنے کے بعد فوراً جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ ایک استثنائی صورت ہے۔ تو جس طرح یہ ایک استثنائی صورت ہے۔ اسی طرح ان کے اجسام (سبز پرندوں کی شکل) بھی ایک استثنائی صورت ہے۔ ورنہ قیامت کے دن انھیں پھر وہ جسم عطا کئے جائیں گے جو اس دنیا میں تھے اور لوگ انھیں پہچانیں گے۔

سماعِ موتی:

اور سماعِ موتی اس لیے ناممکن ہے کہ جو روحیں جسم چھوڑ کر طلیعین یا ستین میں مقید ہیں۔ وہ واپس دنیا میں نہیں آسکتیں۔ اور نہ ہی شہداء کی وہ رُو میں دنیا میں واپس آسکتی ہیں جو براہِ راست جنت میں پہنچ چکی ہیں۔ احادیثِ صحیحہ میں مذکور ہے کہ جنت میں شہداء سے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تمھاری کوئی آرزو ہو تو بتلاؤ تاکہ وہ پوری کر دی جائے؛ تو شہداء جواب دیں گے کہ ہمیں تو یہاں سب نعمتیں میسر ہیں، امد ہمیں کیا درکار ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے بار بار اصرار پر شہداء یہ جواب دیں گے۔ کہ تمھاری آرزو یہ ہے کہ ہمیں دنیا میں واپس بھیج دیا جائے تاکہ ہم پھر شہید ہو کر مزید بلند درجات حاصل کر سکیں؛ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ بات میرے قانون کے خلاف ہے۔ تم دنیا میں واپس

نہیں جاسکتے۔ کوئی اور بات ہو تو بتائیے؟ پھر شہدار جواب دیں گے کہ پھر کم از کم دنیا والوں کو اور ہمارے عزیز واقارب کو اس بات سے مطلع کر دیا جائے کہ ہم ہاں کس تند خوش ہیں اور ہر طرح کے انعامات سے متمتع ہو رہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ ہاں میں یہ اطلاع کیے دیتا ہوں؟ چنانچہ اسی سلسلے میں یہ آیات نازل ہوئیں:

فَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قَاتَلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزُقُونَ • فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْمَعُوا مِنْهُمْ مِنْ خَلْفِهِمْ إِلَّا حَتُورٌ عَلَيْهِمْ ذُلٌّ لَاهُ فَيَجْزَلُونَ •

سب لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے انہیں مرے ہوئے نہ سمجھنا بلکہ وہ تو زندہ ہیں اور انہیں اپنے رب کے ہاں سے رزق مل رہا ہے۔ جو کچھ خدا نے ان کو اپنے فضل سے دے رکھی ہے اس میں وہ خوش ہیں۔ امان لوگوں کو جو اس دنیا میں ان کے پیچھے ہیں اور مکران میں شامل نہیں ہوئے ہیں جو غمخیز جیتے ہیں کہ ان پر

(آل عمران: ۱۶۹-۱۷۰)

نہ کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمناک ہیں؟ غور فرمائیے کہ جنت میں شہدار کی آراؤں میں بھی نہ اپنے عزیز واقارب کو دنیا میں اگر کوئی ہتھیام سانسکتی ہیں اور نہ ہی ان کی قبر پر پکارنے والوں کو کچھ کہہ سکتی ہیں۔ تو وہ روحیں جو بہشتین اور علیین میں مقید ہیں، وہ کیسے دنیا میں واپس آ کر دنیا والوں کی بات سنتی یا ان سے ہم کلام ہو سکتی ہیں؟

۵۔ تناسخ اور روح کلی۔

تناسخ کی طرح روح کلی کا نظریہ بھی ہندوؤں کے فلسفہ سے مستعار لیا گیا ہے۔ جو رہبانیت کے راستہ سے اسلام میں داخل ہوا۔ اور جس کا وحی الہی سے کوئی تعلق نہیں۔ ہندو فلسفہ روح کی مختلف کیفیتوں کو آتما، مہاتما اور پراماتما سے تعبیر کرتا ہے۔ آتما وہ روح ہے جو عام انسانوں کے جسم میں داخل ہے۔ جب یہ روح مختلف جہازوں سے سفر کرتی ہوتی پاک و پوتر ہو جاتی ہے، تو کسی ہندک دہتر انسان کے جسم میں داخل ہوتی ہے اور مہاتما کہلاتی ہے۔ مہاتما گاندھی یا مہاتما بڈھ ان کے ہاں ایسی ہی ہستیاں ہیں۔ پھر جب یہ روحیں مزید پاکیزگی حاصل کرتی ہیں تو پراماتما (خدا یا پریشور) کی روح کے ساتھ مل جاتی ہیں۔ اب دیکھئے مسلمان صوفی بھی حاصل بحق، حاصل باللہ اور فنا فی اللہ جیسی اصطلاحات وضع کر کے اسی ہندوؤں کے عقیدہ کی آبیاری کر رہے ہیں۔ وحی الہی

اس سلسلہ میں روح کی مثالوں کیوں بیان فرماتی ہے :

تم اللہ سے کیسے نعر کرتے ہو۔ تم مردہ تھے
 تو اس نے تمہیں زندہ کیا، پھر وہی تمہیں
 اترتا ہے۔ پھر وہی تمہیں زندہ کرے گا،
 پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے ؟

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَنَسُوا آيَاتِنَا
 فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمَيِّتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ
 إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ؕ

(البقرة: ۲۸)

عام اصطلاح اور اسی طرح شرعی اصطلاح میں بھی روح اور بدن کے اتصال کا نام زندگی اور ان کے انفصال کا نام موت ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جو روح پیدا ہو چکی ہے اس پر موت نہیں آنے گی۔ اب آیت بالا میں پہلی کیفیت یہ ہے کہ روح تو پیدا ہو چکی ہے لیکن اسے ابھی جسم نہیں ملا۔ دوسری کیفیت شکم مادر میں جنین میں روح داخل ہونے سے لے کر موت تک ہے۔ تیسری کیفیت موت سے لے کر قیامت کے دن تک ہے۔ چوتھی کیفیت قیامت سے متعلق ہے۔ جب ارواح کو اجرام ہتیا کیے جائیں گے۔ اور پانچویں خدا کے حضور حاضری دینے سے متعلق ہے۔

اب دیکھئے یہاں نہ تو روح کلی کا کہیں ذکر ہے۔ نہ اس میں مدغم ہونے کا، نہ تحلیل کا یعنی نہ تو کوئی روح خدا کی ذات یا فلسفہ کی زبان میں روح کلی میں شامل ہو سکتی ہے۔ اور نہ ہی خدا کسی انسان کے جسم میں حلول کر سکتا ہے۔ آخری منزل "إِنَّكُمْ تُرْجَعُونَ" کے الفاظ ان سب نظریات کو مردود قرار دیتے ہیں۔ اگر روح کلی میں اتصال کا نظریہ صحیح ہوتا تو "إِنَّكُمْ تُرْجَعُونَ" کے بجائے "فِيهِ يُلْحَقُونَ" یا اس قسم کے الفاظ ہونے چاہئیں تھے۔

اس سلسلہ میں درج ذیل احادیث بھی قابل غور ہیں :

- (۱) عن عدی بن حاتم قال قال رسول
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما منکم من
 أحدٍ إلا سئلکم رقبۃ کبیرۃ ینبئنا
 ونبئنا عنکم حساناً وکلا حجاب ینحجبہ ؕ
 (بخاری، کتاب التوحید)
- (۲) عن جبریر قال لکنا جلوساً عند النبی
 صلی اللہ علیہ وسلم إذ نظرنا إلی القبر
 لیکلۃ البدن قال "إنکم ستورون ربکم
 عدی بن ماتم کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی
 اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم میں سے ہر
 شخص سے اللہ تعالیٰ ضرور بات کریں گے
 وہ بھی اس طرح کہ درمیان میں نہ کوئی
 مترجم ہوگا اور نہ کوئی حجاب جو اس کے
 حضرت جبریر بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم کمر
 و نعر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس
 بیٹھے تھے، اتنے میں آیت نے جو حوسوں

کَمَا تَرَوْنَ هَذَ الْفَعْمَ لَا تَصْنَعُونَ
فِي رُفُوتِهِۦ

رات کے چاند کو دیکھا تو فرمایا تم ضرور
امرئ کے بعد آخرت میں اپنے رب کو اس
طرح دیکھو گے جیسے اس چاند کو دیکھتے ہو
اور تمہیں کوئی آپرین محسوس نہ ہوگی۔

(بخاری، کتاب التوحید)

پھر اس کے بعد اپنے یہ آیت پڑھی:
”وَجُودَ تَوَمَّيْدًا نَاصِعَةً اِلَى رَحْمَتِنَا طَوْرًا“
اس دن بہت سے چہرے پر رونق ہو گئی
اور اپنے پروردگار کے عجز و یدار ہوا گئے۔
(۲۳-۲۲)

اب دیکھیے اگر روح کے تدریج کلی میں اتصال کا نظریہ صحیح ہو تو یہ دیدار الہی، یہ خدا سے ہم کلامی
اور یہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے حساب کتاب لینا، آخر یہ باتیں کس کس حالت میں ممکن
گی؟ ان سب باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ روح کلی میں اتصال کا نظریہ گیان و حیان کا نظریہ تو ہو سکتا
ہے۔ وہی الہی کلی طور پر اس سے ہاں کہتی ہے۔

۶۔ حالت نزع کی رنج و راحت۔

حرمِ حدیث کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ یہ حدیث موجود مزور ہے جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جس
انسان کی روح دنیا اور اس کے متعلقات کی محبت میں جس قدر زیادہ پھنسی ہوئی ہوگی، حالت نزع میں
اس کی جان باروح اتنی ہی مشکل سے نکلے گی۔ اور جس شخص کی روح دنیا اور اس کے متعلقات میں رہ کر بھی
اس سے بے نیاز رہی ہے وہ روح آسانی سے نکلے گی۔ اس بات کو عقل بھی تسلیم کرتی ہے، لیکن یہ قاعدہ
کلیف نہیں ہے، کیونکہ یہ صرف ایک پہلو سے تعلق ہے۔ اس میں بھی مستثنیات موجود ہیں، خود حضور کریم
نے حالت نزع میں کافی تکلیف اٹھائی۔ حالانکہ آپ مذہب کے بلند ترین مقام پر نازل تھے۔ حالت نزع
میں آپ نے جو تکلیف دیکھی اسے دیکھ کر حضرت عائشہ صدیقہ نے اس نظریہ کو مشکوک قرار دیا تھا۔
اس تکلیف کی وجہ خواہ زہر کے اثرات کا مرنے الموت میں دوبارہ عود کرنا ہو یا کوئی دوسری وجہ ہو۔
بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ نے مرنے الموت میں کافی تکلیف اٹھانی تھی۔

۷۔ یدار و حیں۔

بدارواح سے مراد وہ رُو حیں ہیں جو وہی الہی کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتیں، خواہ یہ رُو حیں
انسانوں سے تعلق رکھتی ہوں جو زمین میں مقید ہیں یا ابھی اسی دنیا میں ہیں۔ یا شیطانِ رُو حیں یا جنوں
کی رُو حیں جو اسی دنیا میں موجود ہیں۔ انسانوں کو گمراہ بھی کرتی ہیں اور تکلیف بھی پہنچاتی ہیں۔ قرآن



روح، عذاب قبر اور سماع موتی

(یہ مقالہ محدث صفر، ربیع الاول اور ربیع الآخر ۱۴۰۲ھ میں شائع ہوا۔)

کچھ عرصہ قبل راقم کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس میں "روح سے متعلق چند امور زیر بحث آئے تھے۔ اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے مجھے دو حضرات کی طرف سے یہ سوال نامے موصول ہوئے ہیں۔ پہلے سائل جناب عبدالقادر صاحب سومرو کراچی سے لکھتے ہیں کہ:

"مگر می جناب کیلانی صاحب،

آپ نے اپنے مضمون میں فرمایا ہے کہ:

"ادامع موتی اس لیے ناممکن ہے کہ جو روحیں جسم چھوڑ کر "علیین" یا "سجین" میں مقید ہیں وہ واپس دنیا میں نہیں آسکتیں۔ اور وہی شہداء کی وہ روحیں دنیا میں واپس آ

سکتی ہیں جو براہ راست جنت میں پہنچ چکی ہیں؟

اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں:

۱۔ سماع موتی ناممکن ہے۔

۲۔ مرنے کے بعد اعراج کا دوبارہ جسموں میں آنا ناممکن ہے۔

اور پورا قرآن واحدیہ، صحیحہ اس پر گواہ ہیں کہ مرنے کے بعد قیامت سے پہلے اس جسم میں روح نہیں آسکتی۔ لیکن دوسری طرف مولانا سیف الرحمن افلاح نے اپنے ایک مضمون میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

"ہجرت کرنے والی مومن عورت کی دھار سے اللہ نے اس کے بیٹے کو دوبارہ زندہ

کیا۔؟

پھر جب ہم نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتاب "اتقننا الصراط المستقیم" اور "کتاب الایمان" کا مطالعہ کیا تو عقل حیران رہ گئی کہ صرف یہی نہیں کہ مردہ دوبارہ زندہ ہو گیا، بلکہ اس نے مادہ کی

ساتھ کھانا بھی کھایا۔ اس کے بعد جب غور سے دونوں کتابوں کا مطالعہ کیا تو ذہن بڑی الجھن کا شکار ہو گیا۔ آج تک ہم یہی سمجھتے رہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ ان نظریات اور عقائد کے خلاف جنگ کرتے رہے۔ لیکن ان کتابوں میں تو انہوں نے ان تمام باتوں کو مان کر سند سے دی جو آج کفر و شرک کی بنیاد ہیں۔

شیخ الاسلام دونوں کتابوں "اقتنار الصراط المستقیم" اور "کتاب الوسیلہ" میں لکھتے ہیں:

۱- "جب کوئی شخص کسی آدمی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے، جسے وہ دُنیا میں جانتا تھا اور اس پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی رُوح اس میں نوٹا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اسے سلام کا جواب دیتا ہے؟

(کتاب الوسیلہ ص ۲۲، اردو ترجمہ اسلامی اکیڈمی لاہور۔ اقتنار الصراط المستقیم، اردو ترجمہ مجلس نشر اسلامی کراچی)

۲- اس باب میں ان روایات سے یہاں بحث نہیں جن میں آنحضرت پر سلام کا جواب سنا گیا ہے یا یہ کہ سعید بن المسیب نے واقعہ حترہ کی راتوں میں قبر شریف سے آتی چوٹی اذان سنی تھی۔ یہ سب صحیح ہے بلکہ اس سے زیادہ ہو سکتا ہے؟

(اقتنار الصراط المستقیم ص ۲۲۔ اردو ترجمہ)

۳ "بہر حال میت کا قرآن اور دوسری آوازیں سننا تو حق ہے، لیکن مرنے کے بعد عمل پر اُسے کوئی ثواب نہیں ملتا ہے۔ لیکن مردہ اپنے قریب کئے جانے والے معاصی سے پریشان ضرور ہوتا ہے؟ (حوالہ مذکور ص ۲۳)

محترم! یہ چند سوالات آپ کو بھیج رہا ہوں، اس پر کتاب اللہ اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں تبصرہ فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔ والسلام!

دوسرے سائل محمد احسان الحق صاحب یاروخیل میانوالی (حال اسلام آباد) سے لکھتے ہیں کہ:

"محترم! ایک عرصہ سے میرے ذہن میں مسئلہ عذابِ قبر کے متعلق الجھن اور غلط فہمی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عذابِ قبر حق ہے۔ قبر منازلِ آخرت میں سے ایک بلکہ پہلی منزل ہے۔ اس منزل سے کامیاب گزرنے والا آخرت میں بھی کامیاب ہو جائے گا اور حویلیاں پکڑا گیا اُس کی آخرت کی بھی خیر نہیں۔ عذابِ قبر کے بارے میں مجھے جو اشکال ہے اُس کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱- زندگی موت کی فیند ہے۔ جب مریح جسم میں پڑتی ہے تو جلا متی ہے اور حویب نکال لی جاتی ہے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ پھر یوم البعث کو یہ رُوح دوبارہ جسم میں آئے گی تو انسان

زندہ ہوگا۔ دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی کے درمیان ایک مرحلہ ہے، جسے برزخ کہتے ہیں، اسے برزخی زندگی بھی کہا جاتا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ زندگیاں تو از روئے قرآن دو ہیں آمد موتیں بھی دو، تو یہ برزخی زندگی کیا ہے؟

۲۔ عذاب قبر سے کیا مراد ہے؟ کیا اس کا تعلق رُوح سے ہے؟ بعض مشائخ سے سنا ہے کہ رُوح کا عکس جسم پر رہتا ہے لہذا جسم کو بھی اذیت پہنچتی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو حساب کا کیا مطلب؟

۳۔ "تَبْعًا ذُرْوَجًا فِي جَسَدِهِ" کا کیا مفہوم ہے؟ نفوسِ قرآنی سے ثابت ہے کہ جب رُوح اور جسم ملیں گے تو انسان فوراً اٹھ کھڑا ہوگا۔ جیسے سورہ یس میں ہے: "وَنُفُوسٌ فِي الصُّوْرِ فَإِذَا هُمْ مِنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُونَ"؟

۴۔ کتبِ حدیث میں ہے کہ جب مُرثیے کو دفن کر کے لوگ واپس ہوتے ہیں تو وہ ان کے جوتوں کی آواز سن رہا ہوتا ہے کہ اس کے پاس مُسکرا اور نکیر آجاتے ہیں۔ جب رُوح جسم سے نکل جاتے تو حواسِ خمسہ بھی جاتے رہتے ہیں پھر وہ کس طرح سُنا ہے؟ قرآن بھی تو کہتا ہے: "أَمْ لَمْ نَكُنْ أَذَانًا يَسْمَعُونَ بَلَاءًا"؟

۵۔ مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ اپنی تصنیف "الاولیۃ القویۃ علیٰ ان حیوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی قبرہ لیست بذبیحیۃ" میں صفحہ پر بحوالہ کتاب الرُوح (از ابن قیم) فرماتے ہیں:

"برزخ کا تعلق اس میں گولیدگی ہو جاتی ہے لیکن تجرد کمالی نہیں ہوتا بلکہ سلام کے جواب کے لیے اُسے لُٹایا جاتا ہے۔ لیکن یہ دنیاوی زندگی نہیں ہوتی جو اُسے مرنے سے پہلے حاصل تھی۔"

۶۔ حدیث میں آتا ہے کہ مومن بندہ پر (جب وہ بھیک جواب دیتا ہے تو) قبر صِدِّق نظر تک فراخ ہو جاتی ہے۔ اس طرح کافر پر قبر تنگ ہو جاتی ہے اُسے پھینچ لیتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک صحابی رسولؐ پر قبر تنگ ہو گئی؟

۷۔ جب از روئے قرآن مُردہ نہیں سن سکتا (وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غَفُلُونَ) تو صیغہ ماضی اُرد حروفِ نداء کے ساتھ "أَلَسَلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْقُبُورِ" کیوں کہتے ہیں؟

۸۔ کتاب الرُوح (از ابن قیم) کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

محترم! لہجوں صبر و تحمل کی روشنی میں میرے ان اشکالات کا تدارک فرمائیے!
والسلام علیکم ورحمۃ اللہ!

الجواب بعون الوهاب

رُوح کے متعلق بحث ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ مخلوق عالم نے واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ:

”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ أَلْفٍ أَلَّا قَلِيلًا“
(یٰسٰرہ: ۸۵)

”اور تمہیں مروج سے متعلق ٹھوڑا ہی علم عطا کیا گیا ہے؟“

جس کا واضح مطلب ہے کہ رُوح کی حقیقت اور کونہ تک پہنچنا انسان کے لیے اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ لیکن انسان کی عادت ہے کہ جس بات سے متعلق اس پر بندش مادی کی مانتے، وہ اس بات کی کرید و تفتیش میں دوسری باتوں سے زیادہ توجہ دینا شروع کر دیتا ہے۔ ایسا ہی ایک مسئلہ تقدیر کا تھا جس پر بحث کرنے سے ہر حائر و گایا تھا۔ لیکن اس مسئلہ پر حضرت انسان نے اپنی تحقیق و تفتیش سے وہ وہ گل کھلائے کہ اسی مسئلہ میں اختلاف کی بنا پر امت مسلمہ کے دو فرقے پیدا ہو کر آپس میں متحارب ہو گئے۔ رُوح کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ چنانچہ اس پر بھی جن جن علما نے قلم اٹھایا ہے، ان کی تفصیل میں بہت اختلاف واقع ہوا۔ محولہ بالا مضمون میں میں نے رُوح سے متعلق چند بنیادی باتوں کا ذکر کیا تھا۔ اب کچھ تفصیل پیش خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے ہر اہم مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

زندگی اور موت کے چار مراحل:

جسم اور رُوح کے انفصال کا نام موت اور اتصال کا نام زندگی ہے۔ عام ضابطہ الہی کے مطابق دو دفعہ موت اور دو دفعہ زندگی کا ذکر قرآن کریم میں دو مقامات پر آیا ہے۔ پہلے موت ہے پھر زندگی، پھر موت ہے پھر زندگی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أََمْرًا تُفَاحِيًا كُفِّرُكُمْ وَيُنَبِّئُكُمْ ثُمَّ يَحْيِيكُمْ“

فَهُمَ الْيَوْمَ مُجْتَمِعُونَ ﴿۲۸﴾ (البقرة: ۲۸)

”تم خدا سے کیسے انکار کر سکتے ہو، اس حال میں کہ تم بے جان تھے تو اس نے تمہیں زندہ کیا۔ پھر تمہیں اذیتا ہے پھر زندہ کرے گا۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے؟“ اور قیامت کے دن کفار بھی یہی اقرار کریں گے کہ:

”قَالُوا رَبَّنَا آمَنَّا اِثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اِثْنَتَيْنِ فَاَعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا

فَهَلْ اِلَىٰ خُرُوجٍ مِّنْ سَبِيلٍ؟ (المومن: ۱۱)

”کہیں گے کہ لے جاؤ گے پروردگار! تو نے ہم کو دوبارہ موت دی اور دوبارہ زندہ کیا ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ تو کیا اب (جہنم کے عذاب سے) نکلنے کی

کوئی سبیل ہے؟“

آپ نے دیکھا کہ ان دونوں مقدمات پر اللہ تعالیٰ نے زندگی سے پہلے موت کا وکر کیا ہے زندگی کی طرح موت بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے جو زندگی سے پہلے پیدا کی گئی۔ گویا موت محض عدم یا کسی سببی چیز کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک ایجابی چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حیات سے پہلے پیدا کیا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”اَلَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْاَرْضَ لِيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (الفاتحہ)

”اسی نے زندگی اور موت کو پیدا کیا۔ تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے کام کرتا ہے؟“

پہلا مرحلہ موت ہے۔

روحوں کی پیدائش کب ہوئی؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو پیدا کرنے کے بعد ان تمام روحوں کو بھی پیدا فرمایا، جو اس کی پشت سے تاقیامت پیدا ہونے والی تھیں۔ ”عوبدا لنت“ اسی دور سے متعلق ہے۔ (الاعراف: ۱۷۲) اور یہ دور روح کی پیدائش سے لے کر اس کے شکم مادر میں جنین کے جسم میں داخل ہونے تک پھیلا ہوا ہے۔ روح اگرچہ ایک زندہ و متحرک اور عقل و شعور رکھنے والی چیز ہے، لیکن چونکہ ابھی اس روح کو جسم نہیں ملا جو اعمال کے صدور کا ذریعہ ہے، لہذا اس دور کو موت سے تعبیر کیا گیا۔

اسی دور کے متعلق دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ“

(الاحقاف: ۱۱)

ہم نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہاری صورتیں بنائیں۔ پھر فرشتوں سے فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو؟

اس آیت سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے:

- ۱- تمہاری تخلیق فرشتوں کے آدم کو سجدہ کرنے سے پیشتر وقوع پذیر ہو چکی تھی۔
 - ۲- اس تخلیق کے وقت تمہاری صورتیں بھی بنا دی گئی تھیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ رُوح بھی شکل و صورت رکھتی ہے۔ اس حقیقت کی تائید ان احادیثِ صحیحہ سے بھی ہوتی ہے جن میں مذکور ہے کہ فرشتے جب کسی نیک مسلمان کی رُوح قبض کرتے ہیں، تو اس رُوح کو ریشمی لباس میں لپیٹ کر اللہ کے حضور پیش کرنے کے لیے لے جاتے ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اس رُوح کی شکل کیسی ہوتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس رُوح کی شکل و صورت بھی بالکل وہی ہوتی ہے جو اس کو طے والے جسم کی ہوتی ہے یا ہوگی۔ تبھی تو رُوح میں بھی ایک دوسرے کو پہچانتی ہیں۔ اور اس رُوح کی قالب میں مثال یوں سمجھئے جیسے ذیتوں کے درخت میں روغنِ زیتون یا کونکہ میں آگ یا جلنے والی گیس۔
 - ۳- اللہ تعالیٰ نے رُوح کی تخلیق اور اس کو شکل و صورت عطا کرنے کے باوجود اس دور کو عام بظن کے مطابق موت کے زمانہ سے تعبیر کیا ہے اور یہی موت کی تخلیق کا مفہوم ہے۔
- اب ان چاروں مراحل کی کیفیت اس طرح ہوتی کہ:
- (۱) پیدائش رُوح سے لے کر اس رُوح کو مادہِ شکم میں داخل ہونے تک کا عرصہ۔ اس عرصہ کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔
 - (۲) شکمِ مادر میں جسم میں رُوح کے داخل ہونے سے لے کر موت تک کا عرصہ۔ اسے زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔
 - (۳) موت سے لے کر قیامت کو دوبارہ اجسام میں رُوح کے داخل ہونے تک کا عرصہ۔ اس عرصہ کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔
 - (۴) قیامت کو دوبارہ جی اٹھنے کے بعد لامتناہی مدت۔ اس عرصہ کو زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔
- اب دیکھئے کہ ان چاروں ادوار میں عدم یا فنا اگر ہے تو جسم کو ہے۔ رُوح جب سے پیدا

ہوئی۔ اس کے معنوم یا فنا ہونے کا کوئی مرحلہ پیش نہیں آیا۔ جب رُوح اکیلی ہوتی یا رہ جاتی ہے تو اسے موت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جب بدن میں داخل ہوتی ہے تو اسے زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دوسرا مرحلہ :- دنیوی زندگی

اس مرحلہ میں رُوح بدن میں داخل رہتی ہے۔ یعنی جنین میں رُوح کے داخل ہونے یا جان چڑنے سے لے کر رُوح کے جسم سے نکل جانے یا مرنے تک کا عرصہ دنیوی زندگی کہلاتا ہے۔ زندگی کہنے کا اصل سبب تو یہی ہے کہ اس عرصہ میں رُوح و بدن کا کُلّی اتصال ہوتا ہے۔ لیکن یہ اتصال کئی کبھی منقطع بھی ہو جاتا ہے۔ گویا اس موت و حیات کے قانون میں استثنا کی صورتیں بھی موجود ہیں۔ جن کا ذکر ہم ذرا تفصیل سے کریں گے۔ تاکہ برزخ کے مسائل سمجھنے میں آسانی ہو۔

استثنائی صورتیں :

اُدھر جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا عام منابطہ یا قانونِ قدرت یا سنت اللہ یا عادتِ عامہ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ خود اپنے بنائے ہوئے قوانین کے آگے مجبور و بے بس نہیں ہے بلکہ ان تمام قوانینِ فطرت یا قدرت کے خلاف گا ہے گا ہے اس کی قدرتِ کاملہ کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ آگ کا کام جلانا ہے۔ اور یہ بات اس آگ کی فطرت میں داخل ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ کسی وقت آگ کو یہ حکم دے کہ فلاں شخص کے حق میں "ٹھنڈی اور سلامتی دالی بن جا" تو آگ کو اپنی اصلی فطرت چھوڑ کر اللہ کا حکم ماننا پڑتا ہے۔ پھری کا کام کاٹنا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنے حکم سے پھری کی اس خاصیت کو سلب بھی کر سکتے ہیں۔ انعامات کا یہ کام ہے کہ افترق کے بعد اس کے اجزاء نمودار مل جاتے ہیں۔ لیکن اگر کبھی اللہ تعالیٰ دریا کو یہ حکم دے کہ پھٹ کر بہاؤ کے تودوں کی طرح رُک جا اور درمیان میں کشادہ لاسد بنا دے۔ تو دریا کو اللہ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا صرف ایک قانون ایسا ہے جس میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ اور یہ قانون قوموں کے عروج و زوال سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی جب کوئی قوم بد کرداری کی انتہائی پستیوں کو پہنچ جاتی ہے تو اس کی تباہی یقینی ہوتی ہے۔ خواہ یہ تباہی جلد ہو یا بدیر۔ اللہ تعالیٰ نے اس قانون کو "سُنَّةُ اللّٰهِ" کہا ہے۔ اور قرآن کریم میں چار مختلف مقامات پر ذکر کر کے یہ وضاحت فرمادی ہے کہ اس "سُنَّتِ اللّٰهِ" میں کوئی تغیر و تبدل یا لچک نہیں ہے۔

۱- اچھے موتی یا اسی ذمہ داری میں مردوں کا زندہ ہونا:

رہا موت و حیات کا قانون، جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ تو اس میں بھی استثنائی صورتیں قرآن

کریم سے واضح طور پر ثابت ہیں:

۱- حضرت عیسیٰ مردوں کو قحطاً یا ذین اللہیا کہہ کر زندہ کر دیا کرتے تھے۔

۲- حضرت عزیر کا ایک امیڑی ہوتی اور دیوان شدہ بستی پر گزرتا ہوا تو کہنے لگے۔ اللہ تعالیٰ

اس مردہ بستی کو کیسے زندہ کرے گا؟ تو اللہ تعالیٰ نے انھیں پورے سو سال کے لیے موت

میں ہی پھرزندہ کر کے پوچھا۔ اب بتاؤ کہ تم کتنا عرصہ یہاں پڑے ہو؟ کہنے لگے کہ

”یہی کوئی دن آدھ دن کی بات ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”نہیں بلکہ تم تو سو سال موت کی

حالت میں پڑے رہے ہو۔ ذرا دیکھو تو تمہارے سوا کسی کے گڑھے کے پیچھے کے سوا اور کوئی

چیز رہ گئی؟ دیکھو اب ہم تمہارے سامنے اس پیچھے کے گوشت پوست پہنا کر کئے

پھر سے زندہ کئے دیتے ہیں؟ (البقرہ: ۲۵۹)

۳- بنی اسرائیل میں سے ایک شخص قتل ہو گیا۔ قاتل کا پتہ نہ چلتا تھا۔ سب مشتعل ہو کر ایک گھر

پر الزام دھر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو حکم دیا کہ ایک گائے ذبح کرو۔ پھر اس

مذبح گائے کے گوشت کا ایک ٹکڑا مقتول کی لاش پر مارو۔ تو یہ لاش خود اپنے قاتل کا

پتہ بتلا دے گی۔ چنانچہ جب اس لاش پر مذبح گائے کے گوشت کا ٹکڑا مارا گیا۔ تو مردہ

زندہ ہو گیا۔ اس نے بائیں کیں اور اپنے قاتل کا پتہ بھی بتلا دیا۔ (البقرہ: ۳۱)

۴- حضرت موسیٰ جب تورات لے کر کوہ طور سے بنی اسرائیل کی طرف واپس آئے، تو اس بدبخت

قوم نے یہ اعتراض کر دیا کہ ہمیں کیا معلوم کہ یہ کتاب واقعی اللہ کی طرف سے آئی ہے۔

ہم میں سے کسی نے بھی اسے اللہ کی طرف سے آتے تو دیکھا نہیں۔ پھر یہ یقین کیسے ہو؟

موسیٰ نے قوم کے اس بے ہودہ اعتراض سے نجات کی یہی راہ دیکھی کہ اللہ تعالیٰ سے التجا

کریں۔ چنانچہ وہی الہی کے مطابق اپنی قوم کے ستر آدمیوں کو تجنا اور کوہ طور پر لے گئے۔ وہاں

جا کر جب ان ستر آدمیوں نے اپنے مطالبہ کو دہرایا اور اللہ تعالیٰ کو دیکھنے اور تورات کے

آتے کا منظر دیکھنے پر اصرار کیا، تو اللہ تعالیٰ نے ایک کرک بھج کر ان سب کو موت کے

گھاٹ اتار دیا۔ اب حضرت موسیٰ پھر اللہ سے التجا کرنے لگے۔ بار الہی ان بے وقوفوں

کی اس خواہش پر ٹوٹنے انھیں مار دیا۔ اب میں کیسے واپس جاؤں اور قوم کو کیا کہوں؟ تو

اللہ تعالیٰ نے اُن کو دوبارہ زندگی بخش دی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَمَّا بَعَثْنَاكَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكَ؟ (البقرة: ۵۶)

”پھر ہم نے تمہیں تمہاری موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا؟“

نیز دیکھئے: الاعراف: ۱۵۵

۵۔ حضرت ابراہیم نے محض ایمان قلب کی خاطر اللہ تعالیٰ سے یہی سوال کیا کہ ”مے میرے چڑھا کر

تو مردوں کو کیڑا کر زندہ کرتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا کہ ”یوں کرو کہ چار پرندے لے کر

اُن سے ٹوپ مانوس ہو جاؤ تاکہ اُن کی شکل و صورت کو خوب پہچان سکو۔ پھر اُن کو ذبح کر کے

اُن سب کا گوشت بھی طرح ملا دو۔ پھر اُسے اُٹے جلے گوشت کو چار حصوں میں تقسیم کرو اور

ہر حصہ ایک ایک پہاڑ پر رکھ دو۔ پھر واپس آ کر انہیں ایک ایک کر کے پکار دو وہی پرند

تھکے پاس دوڑتا ہوا آتے گا جسے تم پکارو گے۔ اسی طرح چاروں پرندے تمہارے بٹلنے

کی ترتیب کے مطابق تمہارے پاس حاضر ہوتے جائیں گے۔“ (البقرہ: ۲۶۰)

۶۔ بنی اسرائیل کے ہزاروں لوگ جہاد کے لیے نکل تو کھڑے ہوئے لیکن دشمن کے مقابلہ اور

موت کے ڈر سے اُن کی جان گویا پہلے ہی نکل رہی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں وہیں موت

مے دی، مگر جس بات سے ڈرتے ہو اس کا تو ابھی مزہ چکھو۔ پھر چونکہ اللہ تعالیٰ کو صرف

عبرت دلانا مقصود تھا۔ لہذا انہیں پھر سے زندہ کر دیا۔ (البقرہ: ۲۲۲)

یہ تمام واقعات قرآن کریم میں بھراحت موجود ہیں۔ ہم نے کسی واقعہ کی تشریح و تفسیر

اپنی طرف سے بیان نہیں کیا بلکہ صرف ترجمہ پر اکتفا کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ گو

عام قانون الہی یہی ہے کہ ہر شخص کو دوبارہ زندگی اور دوبارہ موت سے دوچار ہونا ہے۔ مگر کسی

کے حق میں ۳ بار کی زندگی اور ۳ بار کی موت بھی مقدر ہو سکتی ہے۔ گو ایسے واقعات شاذ و نادر

ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں، تاہم ان کے امکان سے انکار کسی کوئی ویر نہیں اور جو لوگ ایسے واقعات

کی تاویلات کرنے بیٹھ جاتے ہیں وہ گویا خدا تعالیٰ کی جاری و ساری قدرت کے منکر ہوتے ہیں۔

ب۔ نیم زندگی (خواب) یا برزخی موت:

اب دیکھئے۔ اس دنیا کی زندگی میں بھی ہر انسان کو موت کا ہلکا سا نقشہ دکھلا دیا گیا ہے

اور یہ موت نیند کی حالت ہے۔ جسے ہم برزخی موت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم نے نیند کو موت کی بہن قرار دیا ہے۔ نیز سونے کے بعد جگنے پر جو دعا رکھ لینی۔ یعنی۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُورُ۔ اس دعا میں نیند کو موت سے

تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ نشور کا لفظ بعث بعد الموت کے لیے آتا ہے۔

برنخ کے معنی بالعموم پردہ یا آڑ کر لئے جاتے ہیں۔ جبکہ عربی زبان میں **برنخ کا لغوی مفہوم**

پردہ کے لیے اور بھی بہت سے لفظ موجود ہیں مثلاً ستر، حجاب، غطار، غلف، اگنتہ وغیرہ۔ اور ان سب الفاظ میں کچھ نہ کچھ ذیلی فرق موجود ہوتا ہے۔ برنخ دراصل دو مختلف یا متضاد چیزوں کے درمیان ایک ایسی تیسری چیز کا نام ہے۔ جس میں پہلی دونوں اشیاء کے ملے جلے اوصاف پاتے جاتے ہیں اور وہ آڑ کا کام بھی لے۔ خواہ یہ اوصاف برابر برابر ہوں یا کسی ایک چیز کے کم اور دوسری کے زیادہ۔ جیسے جنت اور دوزخ کے درمیان اعرف برنخ ہے۔ جمادات اور نباتات کے درمیان مرجان برنخ ہے۔ جو زمعتا اور شاخیں تو نباتات کی طرح پھیلاتا ہے۔ مگر نوع کے لحاظ سے پتھر ہے اور جمادات میں شامل ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ پیٹھے اور کھاری پانی کے درمیان ایک برنخ کی رو پیدا کر دیتا ہے جسے قرآن کریم میں برنخ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نیند اسی لحاظ سے برنخ ہے کہ اس میں زندگی اور موت کے ملے جلے اثرات پاتے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس میں غالب اثرات زندگی کے ہی ہوتے ہیں موت کے نہیں۔

اسی نیند کے معاملہ پر غور کرنے سے رُوح کی بحث بھی شروع ہو جاتی ہے **برنخی موت یا نیند** سب علماء اور اطباء یہ تسلیم کرتے ہیں کہ رُوح کی دو قسمیں ہیں: ایک تو رُوح حیوانی ہے جس کا تعلق گردش خون سے ہے۔ دوسری رُوح کو بعض حضرات نے نفس زیریں سے بھی تعبیر کیا ہے، جب تک گردش خون برقرار رہے رُوح موجود رہے گا اگر یہ رُوح نکل جائے تو گردش خون ختم ہو جاتی ہے۔

دوسری قسم رُوح انسانی ہے۔ جسے نفس بالا یا رُوح انسانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ رُوح کی یہ قسم وہ ہے جو خواب میں سیر کرتی پھرتی ہے۔ رُوح

کی یہ قسم یا رُوح کا یہ حصہ جب انسان کے جسم کو چھوڑ دیتا ہے تو انسان کے حواس خمسہ میں نمایاں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ نیند کے دوران قوتِ باصرہ، لامسہ اور ذائقہ کی کارکردگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قوتِ سامعہ بھی ماند پڑ جاتی ہے۔ ہاں اگر غل غپاٹہ ہو یا کوئی دوسرا آدمی سوتے سوتے آدمی کو آواز دے کر جگائے تو رُوح انسانی دوبارہ فوراً اپنے جسم میں لوٹ آتی ہے۔ اسی طرح تیز قسم کی خوشبو یا بدبو بھی بسا اوقات انسان کے جاگنے کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ اس رُوح انسانی کو اپنے غالب سے عشق کی حد تک محبت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہی غالب اس رُوح انسانی کی آرزوں کی تکمیل کا ذریعہ بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب کبھی نفس کو مخاطب کیا ہے تو اس

سے مراد ہمیشہ یہی نفسِ بالا یا رُوحِ انسانی ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان دونوں رُوحوں کا آپس میں نہایت گہرا اور قریبی تعلق ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک ہی اکائی کے دو جزو ہوتے ہیں۔ رُوحِ نفسانی اگر خواب میں کسی بات یا کسی چیز سے لطف اندوز ہوتی ہے تو انسان جب جاگتا ہے، ہشاش بشاش نظر آتا ہے۔ اور اگر رُوحِ نفسانی کو خواب میں کوئی ناگوار حادثہ پیش آجاتے تو بعض دفعہ انسان سوتے میں ہی چپخنے چلنے لگتا ہے۔ اور جاگتا ہے تو سخت اندوہناک ہوتا ہے۔ اور اگر کہیں خواب میں مار پٹے تو حیرت کی بات یہ ہے کہ اس مار پٹائی کے اثرات اور نشانات بعض دفعہ انسان کے جسم پر نمودار ہو جاتے ہیں جنہیں انسان جاگنے کے بعد خود بھی مشاہدہ کر سکتا ہے۔

خواب سے ہر انسان کو بکثرت واسطہ پڑتا رہتا ہے اس خواب رُوح سے متعلق چند حقائق سے بھی چند ایسے حقائق کا پتہ چلتا ہے جن کے ثبوت دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔

۱۔ خواب میں اس رُوحِ نفسانی کی شکل و صورت بالکل ویسی ہی ہوتی ہے جیسے بستر پر پڑے ہوئے (سوتے ہوئے) اس کے قالب کی ہوتی ہے۔ اور خواب کے دوران جب رُوحیں آپس میں ملتی ہیں تو اس شکل و صورت کی ہم آہنگی کے واسطے سے ایک دوسرے سے متعارف ہوتی ہیں۔

۲۔ ضروری نہیں کہ ان ہی رُوحوں کی آپس میں ملاقات ہو جو اس دُنیا میں زندہ کہلاتے ہیں۔ یہ ملاقات اُن لوگوں سے بھی ہو سکتی ہے جو اس جہان سے رحلت کر چکے یا مر چکے ہیں۔ زندہ کی رُوح مُردہ کی رُوح سے بھی ملاقات کر سکتی ہے اور اس کے برعکس بھی۔

۳۔ خواب میں جو واقعات رُوح کو پیش آتے ہیں ان واقعات کے بیشتر اثرات سے اس رُوح کا مادی قالب بے بہرہ رہتا ہے۔ مثلاً ایک شخص خواب میں خوب سیر ہو کر کھانا کھاتا ہے۔ لیکن جب جاگتا ہے تو بھوکا ہوتا ہے۔ البتہ کچھ کچھ واقعات ایسے بھی ضرور ہوتے ہیں جن سے انسان کا مادی قالب بھی متاثر ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ تاہم عام قاعدہ یہی ہے کہ مادی قالب رُوحِ نفسانی سے خواب کے دوران پیش آمدہ واقعات سے متاثر نہیں ہوتا۔

۴۔ خواب میں رُوحِ راست و اَلْم یعنی ثواب و عذاب سے دوچار ہوتی ہے جتنی کہ مریض ماتی

ہے اور کبھی تو خواب میں زندہ ہو جاتی ہے۔ اور کبھی بیدار ہی پر انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خواب میں تو مگر گیا تھا مگر حقیقتاً زندہ ہے۔

یہ ایسے بدیہی مشاہدات ہیں جن سے ہر شخص کو سابقہ پڑتا ہے۔ اب اگر انسان ان مشاہدات و تجربات کی دہوہ یا اسباب و علل تلاش کرنا شروع کرے تو اس میں ناکام ہی رہے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے یوں فرمائی کہ: "وَمَا أَفْقَرُ إِلَيْكُمْ مِنَ الْعَالَمِ إِلَّا قَلِيلًا"

ان ہر دو اقسام کی رُوحوں کے باہر میں یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ ایک قسم کی رُوح کے خاتمے سے دوسری قسم کی رُوح از خود ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص سویا ہوا کوئی خواب دیکھ رہا ہے کہ کسی دوسرے شخص نے اُسے سوتے میں قتل کر دیا۔ تو رُوحِ نفسانی خواہ کہیں بھی سیر کرتی ہوگی۔ اب یہ دوبارہ اس جسم میں داخل نہیں ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ اُسے وہیں قبض کر لے گا۔ اسی کے برعکس صورت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی انسان کی رُوحِ نفسانی کو خواب میں قبض کر لیں تو

بستر پر سونے والا آدمی بغیر کسی حادثہ یا بیماری کے مر جائے گا۔ ارشادِ باری ہے،
 "اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَازِلِهَا قَدْ عَلِمْنَا
 آلَتِي قَضَىٰ عَلَيْهِمُ الْمَوْتَ ۖ وَيُرْسِلُ الْأَخْرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۗ"

(النجم: ۴۲)

"اللہ تعالیٰ موت کے وقت کسی شخص کی رُوح کو قبض کر لیتا ہے اور اس شخص کی رُوح کو بھی جو خواب میں ہے اور ابھی مرا نہیں، پھر جن پر موت کا حکم کر چکا ہے اُن کو روک رکھتا ہے اور باقی رُوحوں کو جو (خواب دیکھ رہی ہیں) ایک مقررہ وقت تک کے لیے چھوڑ دیتا ہے؟"

آیت مذکورہ بالا سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ یہ آیت اس بات پر سب سے قوی دلیل ہے کہ رُوح کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ رُوح جو کبھی حالت میں بھی بدن کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ اور یہ رُوح حیوانی یا نفسِ زیریں ہے۔ دوسری وہ رُوح جو خواب میں بدن کو چھوڑ کر سیر کرتی پھرتی ہے اور ہر طرح کے واقعات سے دوچار ہوتی ہے۔ یہ رُوح نفسِ بالایا رُوحِ انسانی کہلاتی ہے۔ اسی رُوح کو اللہ تعالیٰ مخاطب فرماتا ہے۔ اور اسی رُوح کو دوام ہے۔

۲۔ رُوحِ حیوانی یا نفسِ زیریں کا تعلق محض بدن سے ہے۔ بدن نہ ہو تو اس رُوح کا کوئی وجود

ہی نہیں رہتا۔ بلکہ یہ رُوح تو بدن کے بوسیدہ ہونے یا فنا ہونے کا بھی انتظار نہیں کرتی۔ موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے ختم ہونے سے بدن بدن نہیں کہلاتا بلکہ جسدِ بیت۔ لاش یا فُش کہلاتا ہے۔

۲۔ بیداری کی حالت میں یہ دونوں قسم کی رُوحیں انسانی جسم میں موجود رہتی ہیں۔ اوسطاً انسان اپنی زندگی کا تیسرا حصہ وقت سو کر گزارتا ہے۔ گویا اس ذمیوی زندگی کا تیسرا حصہ وقت برزخی موت ہے۔ پھر اس ذمیوی زندگی میں اس برزخی موت کی حالت میں بھی زندگی کے اشارتوں کے آثار سے زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس دنیاوی زندگی میں تعسیراً بارہواں حصہ وقت انسان پر موت کے اثرات غالب ہوتے ہیں۔

تیسرا مرحلہ: موت سے لے کر حشر تک عرصہ موت

چونکہ اس عرصہ میں رُوح کو بدن میسر نہیں آتا۔ لہذا یہ عرصہ موت ہے۔ مگر ذمیوی زندگی کی طرح اس عرصہ موت میں بھی استثنائی صورتیں موجود ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

۱۔ عذابِ قبر

اب دیکھئے جس طرح انسان ذمیوی زندگی میں موت کے اثرات سے دوچار ہوتا ہے، بعینہ اسی طرح عرصہ موت (مرنے کے وقت سے لے کر رد و قیامت تک کی موت) میں زندگی کے اثرات سے بھی دوچار ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو علمائے کئی طریقوں سے واضح کرنے کی کوشش فرمائی ہے بعض تو یہ کہتے ہیں کہ اس بات کے باوجود کہ رُوحیں سجین اور عینین میں ہوتی ہیں۔ تاہم ان رُوحوں کا ہلکا سا تعلق اپنی اپنی قبروں سے قائم رہتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ان رُوحوں کا عکسِ قبر پر بھی پڑتا ہے بعض دوسرے علمائے کئی حقیقت کو تو یہ ادا کیا کہ اس عرصہ موت میں رُوح اور بدن کا انحصار کئی نہیں ہوتا۔ گویا رُوح اور بدن کا تعلق قائم تو مستقل طور پر رہتا ہے مگر یہ تعلق بہت ہلکا اور کمزور ہوتا ہے۔

مجھے اس مسئلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو بصیرت عطا فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ

عذابِ قبر کی حقیقت (۱) اس عرصہ موت میں رُوح و بدن میں کئی طور پر انحصار ہو جاتا ہے مگر جس طرح ذمیوی زندگی میں بحالتِ خواب کبھی کبھار رُوح بدن کو چھوڑ جاتی ہے۔ بعینہ اس طرح موت میں کبھی کبھی رُوح اپنے بدن سے آلتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دنیاوی زندگی میں

انسان سونے یا آرام کرنے کے لیے کسی حد تک خود مختار ہوتا ہے۔ لیکن خواب اور اس میں سوج کے ادوات اس کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتے۔ جبکہ اس ہنسی عالم میں کچھ بھی انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔ سب کچھ من جانب اللہ ہوتا ہے۔ گویا رُوح و بدن کا یہ تعلق قهر ہکا اور کمزوری نہیں ہوتا بلکہ غیر مستقل ہوتا ہے اور اضطراری بھی۔

۲۔ پھر جس طرح، ایک دن رات یا ۲ گھنٹہ کے عرصہ میں انسان رات کو یا کسی وقت دن کو سوتا ہے تو خواب کی صورت میں اُس کی رُوح بدن چھوڑ جاتی ہے، اسی طرح اس عرصہ موت میں دن میں ایک دوبار اپنے قالب یا قبر کی طرف لوٹائی جاتی ہے۔

۳۔ پھر جس طرح خواب کی حالت میں رُوح کے بدن کو چھوڑنے کے وقت بھی حقیقتاً حیات کے آثار غالب ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس عرصہ موت میں رُوح کی بدن سے ملاقات کے دوران بھی موت کے آثار غالب رہتے ہیں۔

۴۔ نیز جس طرح خواب میں رُوح راحت و آلم سے دوچار ہوتی ہے، اور کبھی کبھی اس کے اثرات بدن پر بھی نمودار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اس عرصہ موت میں رُوح کو عذاب و ثواب ہوتا ہی ہے، تاہم اس ملاقات کے دوران اس کے اثرات جسم یا اس کے ذرات پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ اور یہی عذاب و ثواب کی حقیقت ہے۔

اب دیکھئے امام بخاریؒ نے قرآن کی درج ذیل آیت سے عذابِ قبر

قرآن اور عذابِ قبر

کا استشہاد کیا ہے۔ ارشاد باری ہے،

سَأْتَا رُيْعْرَهٗ مَبْنُوْنَ عَلَيْهِمَا عَذْرَا وَاَعْيُنُهُنَّ يَكْفُرْنَ لِيَوْمَ نَقُومُ السَّاعَةَ اَدْخَلْنَا اِلَآ
فِرْعَوْنَ اَشَقَّ الْعَذَابِ ۝ (المؤمن: ۴۶)

”وہ صبح و شام آگ (راتش جہنم) پر پیش کئے جاتے ہیں۔ پھر جب قیامت برپا ہوگی تو ہم کہم دیں گے کہ، اے فرعون کو سخت عذاب میں داخل کر دو“

اس آیت سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے،

۱۔ عَذْرَا وَاَعْيُنُهُنَّ کے الفاظ ہمارے اسی موجودہ نظام شمسی کے حساب سے ہیں۔ دن بھر میں ایک دوبار عذاب پر پیش کرنے کا واضح مطلب یہ ہے کہ صبح اور بدن کا اتصال مسلسل نہیں ہے۔ ورنہ فرعون جیسے ظالم اور کافر کو تو قبر میں عذاب سلسل ہی دیا جانا چاہیے تھا۔

۲۔ انھیں صرف عذاب پر پیش کیا جاتا ہے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جس طرح خواب میں

راحت و اطمینان کے اثرات ہمہ گیر نہیں ہوتے اسکی قبر میں عذاب و ثواب کے اثرات ہمہ گیر نہیں ہوتے۔ یعنی عذاب و ثواب کا اثر قیامت (زندگی) کی نسبت بہت ہلکا اور کمزور ہوتا ہے۔
۳۔ البتہ قیامت کے دن ان لوگوں کوئی تحقیقت آتش جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ یہ زندگی کا عرصہ ہے اور اس عرصہ میں رُوح و بدن کا تعلق مسلسل اور مستقل طور پر قائم ہے لہذا عذاب و ثواب شدید بھی ہوگا اور مستقل بھی۔

دوسری آیت جس سے امام بخاری نے عذابِ قبر کا استشہاد کیا ہے وہ استشہاد کی حد تک تو درست ہے مگر اس سے مسئلہ کے صرف ایک پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

”وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُو أَيْدِيهِمْ
أَخَذُوا نَفْسَهُمْ أَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ“ (الانعام: ۹۴)
سکاش تم ان ظالموں کو اس وقت دیکھو جب موت کی سختیوں میں مبتلا ہوں۔ اور فرشتے ان کی طرف ہاتھ بڑھا رہے ہوں کہ نکالو اپنی جانیں۔ آج تم کو ذلت کے عذاب کی سزا دی جائے گی؟

یہ آیت درج کرنے کے بعد امام بخاری لفظ ھُون کی تشریح کرنے فرماتے ہیں:

”قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ الْهُونُ هُوَ الْهَوَانُ وَالْهُونُ الرَّفَقُ“

(بخاری۔ کتاب الجنائز۔ باب ما ہمار فی مزاب القبر)

”امام بخاری نے کہا کہ ھُون کا معنی ھَوَان یعنی ذلت اور رسوائی ہے۔ اور ھُون کا معنی نرمی اور ملائمت ہے۔“

آیت بالا اور امام صاحب کے اجتہاد سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ عذاب (و ثواب) قبر میں آنے کے وقت سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ”الیوم“ کے لفظ سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

۲۔ یہ عذاب بھی گود ذلت و رسوائی کا ہوگا۔ تاہم اشد العذاب یا عذابِ عظیم کی نسبت بہت ہلکا اور کمزور ہوگا۔

ہمارے اس خیال کی تائید بہت سی احادیث صحیحہ سے بھی ہوتی ہے۔ جن میں یہ مذکور ہے کہ مومن کے پاس قبر میں فرشتے آتے ہیں، تو پہلے اس پر دوزخ کو پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر تم دنیا میں بد اعمالیاں کرتے تو تمہارا ٹھکانا یہ دوزخ ہوتی۔ پھر اس پر جنت کو پیش کر کے کہا جاتا ہے

کہ چونکہ تم نے دُنیا میں اپنی زندگی احکامِ الہی کی اطاعت میں بسر کی ہے۔ لہذا اب تمہارا مکانِ جنت ہوگا۔ پھر جنت سے ایک روزن اس کی قبر میں کھول دیا جاتا ہے۔ اور کافر سے معاملہ بعینہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

قبر اور جدت انسان کو جب قبر میں داخل کیا جاتا ہے تو کچھ عرصہ بعد اس کے جسم کو مٹی یا کیرے کا کھا جاتے ہیں۔ ہڈیاں بھی ایک مدت بعد بوسیدہ ہو کر مٹی میں مل کر مٹی بن جاتی ہیں۔ بعض اوقات قبروں کے نشان تک بھی مٹ جاتے ہیں۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رُوح کا یہ جڑتی اتصال آخر کون سے بدن سے ہوتا ہے۔ اور جب قبر کے نشان تک مٹ کر اس پر بازار بن چکے ہیں یا کھیتی کاشت کی جا چکی ہو تو وہ قبر ہے کون سی جس میں مذاب ہوتا ہے؟

اس سے آگے چلنے بعض لوگ اپنے مُردوں کو دفن ہی نہیں کرتے بلکہ لاش کو جلا دیتے ہیں پھر اُس کی راکھ کو دریا میں بہا دیتے ہیں۔ بعض لوگوں کی موت یوں واقع ہوتی ہے کہ انھیں دندے پھاڑ کھاتے ہیں۔ اور میت اس درندے کا جڑو بدن بن جاتی ہے۔ بعض لوگ پانی میں ڈوب کر مر جاتے ہیں تو آبی حیوانات کی خوراک بن کر اُن کا جڑو بدن بن جاتے ہیں۔ تو آخر وہ کون سی قبر یا بدن ہے جس کے ساتھ اس عرصہ موت میں رُوح کے اتصال کا امکان باقی رہ جاتا ہے؟

اب اس سے بھی آگے بڑھیے کہ جو درندے یا آبی جانور کسی میت کی قبر بنے ہیں۔ وہ بھی بالآخر مکر مٹی میں بل جاتے گے۔ تو قبر یا بدن والی آخر کونسی بات رہ جاتی ہے جس سے رُوح کا اتصال ہو؟ جب ہم یہ سوچتے ہیں تو معاملہ اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ انسان کی لاش مٹی میں مل کر مٹی کے ذرات میں ہی تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کلیہ میں اگر استثناء ہے تو صرف یہ کہ انبیاءِ قبروں ہی میں دفن ہوتے ہیں۔ اور اُن کے اجساد کو مٹی نہیں کھا سکتی۔ جیسا کہ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے۔ پھر اس کے بعد کچھ ایسے صلحاء بھی اس ضمن میں آ سکتے ہیں جن کے اجساد کو کھانا اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے۔ اس بات کا امکان ضرور ہے مگر اہلِ حق نہیں کیا جاسکتا۔ انبیاء کے اجساد کو زمین کیوں نہیں کھاتی؟ یہ ایک انگِ بحث ہے جو خاصاً انبیاء سے تعلق رکھتی ہے، جس کا یہاں موقع نہیں۔

مندرجہ بالا تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ لاش کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ابتدائی صورت جب تک اس کا جسد قبر میں بحال رہتا ہے، یا پھر قبر کے نشانات قائم رہتے ہیں۔ اس حالت کے لئے اللہ تعالیٰ نے قبر کا استعمال فرمایا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

”وَمَا أَنْتَ بِمُسْتَمِعٍ مِّنْ بِنِي الْقُبُورِ“ (فاطر: ۲۲)

اے محمد! آپ ان لوگوں کو سنا نہیں سکتے جو قبروں میں ہیں۔
اور دوسری حالت آخری حالت ہے۔ جبکہ نہ تو قبر کا نشان باقی رہ جاتا ہے اور نہ جسم کا، بلکہ
وہ مٹی میں مل کر مٹی بن جاتا ہے۔ تو اس حالت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ”حدیث“ کا لفظ استعمال فرمایا،
ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُم مِّنَ الْأَجْذَاثِ إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ يَكْبِتُونَ“ (الہٰجیہ)

”پھر جب صور میں پھونکا جائے گا تو لوگ اپنی اپنی اجڑا ہونے سے نکل کر اپنے پروردگار
کی طرف دوڑ پڑیں گے۔“

گویا قیامت کے برپا ہونے کے وقت نفخہ رناتی پھونکا جائے گا جس کا اثر یہ ہوگا کہ مٹی میں
پلے ہوئے ذرات فوراً متحرک ہو کر آپس میں مل کر جسم کی شکل اختیار کر جائیں گے۔ پھر ان اجسام
کی رُو میں ان میں مستقل طور پر داخل ہو جائیں گی۔ پھر یہ لوگ اپنے پروردگار کی آواز پر لٹیک کہتے
ہوتے میدانِ محشر کی طرف دوڑتے ہوئے پہنچ کر اپنے رب کے حضور ہمیشہ ہو جائیں گے۔

اب رہی یہ بات کہ حدیث کی صورت میں رُوح کا اتصال (اگرچہ
عذابِ قبر کا عقلی ثبوت) وہ کبھی کبھار اور کمزور سا ہوتا ہے، ممکن بھی ہے یا نہیں؟ تو اس کا

جواب تو یہ ہے کہ یہ ممکن ہے۔ کیونکہ اہل حدیث صحیحہ سے اور قرآن سے بھی عذاب و ثوابِ قبر کا دوام
ثابت ہے۔ اور عقلی لحاظ سے بھی یہ ممکن ہے۔ کیونکہ جسم کے کسی ادنیٰ سے جھٹنے یا ذرے پر تکلیف
سے رُوح متاثر ہو جاتی ہے۔ اور اب تو سائنس کے جدید انکشافات نے اس مسئلہ کو اور بھی
قابلِ فہم بنا دیا ہے۔ جسم کی ساخت میں غلیات کا کردار اور ان کا بناؤ بجاڑ۔ نیز نفسا میں ازل
پیدا شدہ انسانی اور غیر انسانی آوازوں کا محفوظ ہونا اور ان آوازوں کو الگ الگ کر لے کا امکان
ایسی باتیں ہیں جو حدیث سے بعثت بعد الموت کے امکان کو ٹھوس ثبوت، ہم پہنچا دیتی ہیں۔ اور
اس بات کا بھی کہ ان ذرات سے رُوح کے اتصال کا امکان، ممکن ہے۔

عذابِ قبر کا تعلق رُوح اور بدن دونوں سے ہے | بدن یا جسم میں اگرچہ عقل و شعور اور
ارادہ و اختیار نہیں ہوتا۔ لیکن چونکہ

لے قبر اور حدیث کا یہ لغوی فرق شاید لغت کی کسی کتاب سے ذیل کے گا۔ یہ جو کچھ فرق میں نے بیان کیا ہے،
قرآن کریم کے طرز بیان کو ملحوظ رکھ کر پیش کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اس پر مزید بحث آگے آئے گی۔

وہ ایک آلہ کار کی حیثیت سے رُوح کے نیک و بداعمال کا ذریعہ بنتا ہے۔ لہذا اس برزخی زندگی میں وہ بھی اپنی موجودگی کی مناسبت سے عذاب و ثواب میں شریک ہوتا ہے۔ اس برزخی زندگی میں رُوح تو مستقل طور پر زندہ رہتی ہے مگر بدن کو یہ پائیداری حاصل نہیں۔ لہذا اس عذاب و ثواب کا بیشتر حصہ رُوح ہی کے حصہ میں آتا ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ عرصہ موت ہے جس میں زندگی کے آثار جیسے کچھ بھی ہوں بہت کمزور ہوتے ہیں۔ جس طرح ذمیوی زندگی میں خواب جیسی نیم زندگی ہونے کے باوجود اس عرصہ کا نام زندگی ہے۔ کیونکہ اس عرصہ میں زندگی کے آثار زیادہ قوی ہوتے ہیں۔ مرحلہ ۱ (ذمیوی زندگی) میں موت (نیند) اور مرحلہ ۲ میں برزخی زندگی کے وجود کی طرف رسول اللہ کے درج ذیل ارشاد میں پوری طرح صراحت موجود ہے۔ فرمایا:

”الْكَافِرُ نِيَامٌ إِذَا مَاتَ لَوْ لَا انْتَبَهُوا“

”لوگ سوتے جوتے ہیں، جب مرے گے تو ان کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔“

برزخی زندگی کی حقیقت صرف اتنی ہے جتنی اس دنیا میں خواب کی ہے۔ پھر جس طرح خواب میں رُوح کچھ کچھ سے دوچار ہوتی ہے، اوریہ سمجھتی ہے کہ وہ فی الواقعہ ان ولادات سے نوجا ہے لیکن اس کے باوجود واقعات کی خارجی دنیا میں اس کا کچھ وجود نہیں ہوتا جیسا کہ برزخی کیفیت میں جہاں تک شح کے عذاب و ثواب کا تعلق ہے، وہ فی الواقعہ مکمل طور پر اس سے دوچار ہوتی ہے، لیکن خارجی دنیا میں اس کا وجود نہیں ہوتا۔ اب دیکھئے انسان دوہی طرح کے ہیں، ایک مومن، دوسرے کافر۔ مومن کے لیے قبر فراخ کر دی جاتی ہے اور کافر کے لیے قبر تنگ کر دی جاتی ہے کہ میت کی ہڈیاں ایک دوسری میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ اوریہ واقعات میت کی تدفین کے فوراً بعد شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ اس میت کی قبر کو اکھاڑ کر دیکھیں گے تو قبر کی ساخت میں کوئی تبدیلی نہ پائیں گے۔

پھر جس طرح خواب میں بعض اوقات رُوح کے علاوہ بدن بھی متاثر ہوتا ہے۔ اسی طرح برزخ کے عذاب و ثواب میں بھی بعض دفعہ بدن پر اثر ہو جانا ممکن ہے۔ اوریہ وہ وقت ہوتا ہے جب کبھی رُوح و بدن کا اتصال ہو ان سب باتوں کے باوجود یہ مدت ”موت“ ہے۔

اب رہی یہ بات کہ اگر عذاب و ثواب قبر ہی سے شروع ہو جاتا ہے | آزائش اور حساب کا فرق | تو پھر آخرت میں اور کونسا حساب لینا باقی رہ جائے گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قبر میں حساب نہیں لیا جاتا۔ صرف سرسری جانچ کی جاتی ہے۔ منکر نکیر آتے ہیں اور

تین بنیادی باتوں کے متعلق تین موٹے موٹے سوال پوچھتے ہیں۔ یہ گویا تہ سہری ساز بانی استخوان بتوا ہے۔ جس سے میت کو دنیا میں اپنی کارکردگی اور آئندہ زندگی میں ان اعمال کے اثرات کا پتہ چل جاتا ہے۔ اور اسی آزمائش کے نتیجہ میں میت کو خوشی یا غمی کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں۔ قبر میں عذاب و ثواب کی حکمت یہ ہے کہ:

۱۔ مومن کو جنت دکھلا دی جاتے اور اُسے جنت کی خوشخبری دے کر نہ صرف یہ کہ اُس کے ذہنی اطمینان و انبساط کا سامان مہیا کیا جاتے بلکہ جنت کی کچھ تھوڑی بہت نعمتوں سے بھی سرفراز کیا جائے۔ اور ان نعمتوں کی نسبت اتنی ہی ہوتی ہے جتنی اس عرصہ موت کو زندگی سے نسبت ہے۔

۲۔ کافروں کو پہلے جنت دکھلا کر پھر دوزخ پیش کی جاتے تاکہ ان کو مزید حسرت دیاں ہو۔ اور جہنم سے بھی پہنچایا جاتے۔

۳۔ گنہگار مسلمان کو عذاب اس لیے دیا جاتا ہے کہ یہ عذاب اس کے گناہ کا کفارہ بن جائے۔ اور وہ بعثت بعد الموت کے جنت میں جانے کے قابل بن سکے۔ اور اگر وہ زیادہ گنہگار ہے تو آخرت میں اس گناہوں کے بدلہ میں اس حد تک تخفیف کر دی جاتے، جس حد تک وہ عذاب قبر میں ٹھگت چکا ہے۔

اور حساب کا معاملہ آزمائش سے سخت اور شدید تر ہے۔ کیونکہ حساب اللہ تعالیٰ خود لیں گے۔ دنیوی زندگی کا سارا ریکارڈ سامنے رکھ کر حساب لیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی عدالت ہوگی۔ اعمال کیلئے میزان ہوگا۔ شہادتیں مہیا کی جائیں گی۔ اور یہ سب میدانِ محشر میں اس جو تھے مرحلہ میں ہوگا۔ جس کا نام بعثت بعد المات یا اخروی زندگی ہے۔ جب روح اور بدن منسلک ہوں گے اور عذابِ ثواب کا اثر شدید، ہمگیر اور دائمی ہوگا۔

پھر اس حساب یا عدالتی انصاف کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو محض اللہ کے حضور پیشی اور تہ سہری پوچھ پچھ ہے۔ جو انصاف کے بجائے اللہ کی رحمت کو نمایاں کرتی ہے۔ لوگوں سے بالعموم اسی قسم کا حساب لیا جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ رعائتی نمبر سے کو بھی پاس کرتے جاتیں گے۔ اور حساب کی یہی قسم "حِسَابًا یَسِیرًا" کہلاتی ہے۔ جس کے لیے مسلمانوں کو دُعا رکھلائی گئی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس دن بھی انصاف پر اتر آئیں۔ اور ہر شخص کے اعمال کو ہی جنت میں داخلہ کا سبب قرار دیا جائے تو شاید کوئی شخص بھی جنت میں داخل نہ ہو سکے۔ اِلا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اُسے ڈھانپ لے۔

(ب) سماع موتی

سماع موتی کا مسئلہ عذاب قبر یا روح کی حقیقت کی طرح محض ایک تحقیقی مسئلہ ہی نہیں بلکہ شرک کا سب سے بڑا چور دروازہ ہے۔ لہذا قرآن مجید نے سماع موتی کے تمام اسکاٹنی پہلوؤں کو پوری قوت سے ختم کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں درج ذیل آیات قابل غور ہیں:

۱- وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ وَأَمْوَالُهُمْ غَيْرُ أَحْيَاءٍ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ۝ (النحل: ۲۱، ۲۲)

”اور جنہیں خدا کے سوا یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کچھ پیدا نہیں کر سکتے بلکہ وہ تو خود پیدا شدہ ہیں۔ وہ لاشیں ہیں بے جان، ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔ دوسرے مقام پر فرمایا:

۲- وَمَا يَسْتَوْسَوِ الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ إِنَّ اللَّهَ يُسْمِعُ مَنْ يَشَاءُ وَمَا أَنْتَ بِسَمِيعٍ مَنْ فِي الْقُبُورِ ۝ (فاطر: ۲۲)

”زندہ اور مرے برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ تو جس کو چاہے سنا سکتا ہے لیکن (موتی) تم ان لوگوں کو سنا نہیں سکتے، جو قبروں میں مدفون ہیں۔“

اور تیسرے مقام پر فرمایا:

۳- وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غَفِلُونَ ۝ وَإِذْ أَخْبَرْنَا النَّاسَ كَانُوا كَرَاهًا أَعْدَاءُ قَوْمِهِمْ كَانُوا بِعِبَادَتِهِمْ كَاهِنِينَ ۝ (الاحقاف: ۲۵)

”اور اس شخص سے بڑھ کر اور کون گمراہ ہو گا جو ایسے کو پکارے جو قیامت تک اُسے جواب دے سکے، بلکہ ان کو ان لوگوں کے پکارنے کی خبر بھی نہ ہو۔ پھر جب لوگ (روز قیامت) اٹھے کئے جائیں گے تو وہی پکارے گئے لوگ ان پکانے والوں کے دشمن بن جائیں گے۔ اور ان کی پرستش سے انکار کر دیں گے؟“

مندرجہ بالا آیات سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱- غائب یا فوت شدہ لوگوں کو پکارنا ان کی عبادت کرنے کے مترادف ہے۔ بالفاظ دیگر شرک ہے۔

- ۲۔ غائب یا فوت شدہ لوگ کسی کی پکار کا جواب دینا تو درکنار ان کی بات سن بھی نہیں سکتے۔
- ۳۔ قبروں میں پڑے لوگ زندہ نہیں ہیں بلکہ بے جان اور مردہ ہیں۔ انھیں اپنی ذات کے متعلق بھی کچھ علم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔
- ۴۔ البتہ ایک استثنائی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اگر اللہ چاہے تو ان مردوں کو سنا سکتا ہے اس کے علاوہ ان کے سننے کا کوئی ذریعہ نہیں۔

استثنائی صورت اب دیکھتے یہ استثنائی صورت وہی ہے جسے ہم ذیوی زندگی میں خواب کی مثال میں پیش کر چکے ہیں۔ خواب میں بھی رُوحیں اپنی مرضی سے ملاقات نہیں کر سکتیں۔ پھر جس طرح خواب میں رُوحیں آپس میں ایک دوسرے سے بات چیت کرتی اور ایک دوسرے کی سنتی بھی ہیں۔ لیکن سویا ہوا آدمی پاس بیٹھے ہوئے آدمیوں کی گفتگو نہیں سن سکتا۔ کیونکہ عالم خواب اور عالم ہے اور عالم دنیا اور عالم۔ اسی طرح مردہ لوگ جو عالم دنیا کے علاوہ کسی دوسرے عالم (عالم برزخ یا عالم مثال) میں ہوتے ہیں، وہ دنیا کے لوگوں کی باتیں کیونکر سن سکتے ہیں؟ عام ضابطہ الہی یہی ہے کہ مردے کسی کی بات سن نہیں سکتے۔

اب دیکھئے کہ :

استثنائی صورتوں کے نتائج

- (۱) دوبار زندگی اور دوبار موت ایک عام ضابطہ الہی ہے مگر مرحلہ عطا میں مردوں کا زندہ ہونا استثناء کی صورت ہے۔ جسے چند عقل پرستوں یا نیچر پرستوں کے علاوہ سب مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔
- ۲۔ اسی مرحلہ عطا یا ذیوی زندگی میں دوسری استثنائی صورت خواب یا نیم موت ہے۔ یہ بات قرآن سے ثابت ہے اور چونکہ یہ ہر شخص کے مشاہدہ میں آتی ہے۔ اس لیے اس کا کوئی انکار نہیں کرتا۔ خواب میں چونکہ موت کے اثرات بہت ہلکے ہوتے ہیں۔ لہذا یہ نیند کا عرصہ بھی حیات ہی میں شمار ہوتا ہے۔

- ۳۔ مرحلہ عطا یعنی مرنے سے یوم البعث کے عرصہ کو قرآن نے موت سے تعبیر کیا ہے حالانکہ اس میں بھی زندگی کے ہلکے سے آثار پاتے جلتے ہیں۔ قبر کے عذاب کا ثبوت قرآن سے بھی ملتا ہے۔ اور احادیث صحیحہ سے بھی واضح طور پر ثابت ہے۔ اس استثنائی صورت کو بھی سب مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ منکرین حدیث کا ایک طبقہ ایسا ہے جس نے قرآن کی آیات کی تاویل کر لی۔ اور احادیث کو تسلیم کرنے سے انکار کر کے اس استثنائی صورت کا

انکار کر دیا۔

۴۔ مرحلہ ۳ میں دوسری استثنائی صورت سماعِ موثیٰ ہے۔ اس کے متعلق عام ضابطہ الہی یہی ہے کہ مرفوعے سن نہیں سکتے۔ اور استثنائی صورت یہ ہے کہ اگر اللہ چاہے تو ان مرفوعوں کو سنا سکتا ہے۔ پھر کچھ احادیث صحیحہ بھی ایسی ہیں۔ جن میں یہ احتمال پیدا ہوتا ہے کہ مرفوعے سن سکتے ہیں۔ لہذا اس مسئلہ میں امت میں اختلاف واقع ہوا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس مسئلہ میں قرنِ اول میں بھی اختلاف موجود تھا۔ مثلاً حضرت قتادہ اور حضرت عائشہؓ تو سماعِ موثیٰ کے منکر تھے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سماعِ موثیٰ کے نائل تھے۔ البتہ یہ بات مفرد ہے کہ صحابہؓ میں اختلاف سننے کی حد تک تھا۔ یہ بات قطعاً مختلف فیہ نہیں تھی کہ وہ سن کہ جو اب بھی دے سکتے ہیں۔ مگر آج یہ مسئلہ سنگین نوعیت اختیار کر گیا ہے۔ سماعِ موثیٰ کے قائلین صرف یہی نہیں کہتے کہ مرفوعے سن سکتے ہیں بلکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مرفوعے اہل دنیا کی بات سن کر جواب بھی دیتے ہیں۔ مزید برآں سائل کی حاجت برآری کرنے کی قدرت اور تعریف بھی رکھتے ہیں۔ یہ طبقہ گروہِ صوفیہ سے تعلق رکھتا ہے جن کا پیری مریدی کا سلسلہ ان اعتقادات کے بغیر چلنا ممکن ہی نہیں۔ ہم سردست مرفوعوں کے جواب دینے اور حجت برآری کرنے کے مسئلہ کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف سماعِ موثیٰ کی حد تک ان قائلین کے دلائل کا جائزہ پیش کرتے ہیں:

سماعِ موثیٰ کے قائلین کا طریق استدلال

قرآن مجید چونکہ سماعِ موثیٰ کی سماعت اور کھلی ترمیم کرتا ہے اس لیے یہ حضرات ایسی تمام آیات کی تائید کر جاتے ہیں۔ جو سماعِ موثیٰ کی ترمیم کرتی ہیں۔ مثلاً:

(و) موثیٰ سے مراد حقیقی مرفوعے نہیں بلکہ دل کے مرفوعے یا کافر لوگ ہیں اور ان کو سنا نہیں سکتے۔ کا مطلب یہ ہے کہ آپ انھیں راہِ راست پر نہیں لاسکتے اور اللہ کے سنانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی انھیں راہِ راست پر لاسکتا ہے۔

(ب) جن بے جان ہستیوں کے پکارنے کا ان آیات میں ذکر ہے اس سے مراد بزرگ نہیں بلکہ وہ اصنام یا شمس و قمر اور مظاہر قدرت ہیں۔ جن کی پرستش کی جاتی رہی ہے۔ یہی وہ

چیزیں ہیں جو ذہن سکتی ہیں نہ جواب دے سکتی ہیں۔ اور بے ہمان اور بے شعور ہیں۔ رہے بزرگ تو ان کی زندگی میں جب ان کی پرستش ہی نہیں ہوئی تو ان آیات سے یہ بزرگ کیسے مراد لئے جاسکتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

یہ تو واضح ہے کہ آج تک عبادت یا تو موتوں کی ہوتی رہی ہے یا مظاہرہ فرشتوں کی یا پھر فوت شدہ بزرگوں کی۔ یہ بزرگ گواہی زندگی میں اپنی عبادت سے منع کرتے رہے مگر جب لوگوں نے ان کی وفات کے بعد ان کی قبروں پر پکارنا شروع کیا تو ان کی اسی پکار کو قرآن نے عبادت سے تعبیر کیا ہے۔ عبادت کا مطلب صرف پوجا پاٹ نہیں ہوتا بلکہ کسی کو نفع پہنچانے یا نقصان سے بچانے کے لیے پکارنا ہی عبادت اور اس میں شامل ہے۔ اور بالعموم انہی دو باتوں کے لیے کسی کو پکارا جاتا ہے۔ اب دیکھئے کہ:

۱۔ آیت میں "أَمْوَاتٌ غَيْرِ أَحْيَاءٍ" کا اطلاق نہ جنوں پر ہو سکتا ہے نہ فرشتوں پر، اور الفاظ "بَعثَ بَعْدَ الْمَوْتِ" کا اطلاق جنوں یا دیگر مظاہر قدرت پر نہیں ہو سکتا۔ اب باقی صرف فوت شدہ بزرگ ہی رہ جاتے ہیں جن پر اس آیت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

۲۔ آیت میں گو موتی سے مراد مردہ منمیر کا فرج بھی لیے جاسکتے ہیں۔ لیکن اس آیت یا سیاق و سباق میں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں کہ الفاظ کے ظاہری معانی کو چھوڑ کر یہ مجازی معانی اختیار کئے جاتیں۔

۳۔ آیت میں "وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غَفِلُونَ" کے الفاظ کو جنوں اور فرشتوں کو معبودان باطل کے زمرہ سے خارج کر دیتے ہیں کیونکہ وہ دُعائے من سکتے ہیں۔ اور "كَانُوا أَنْهَمُ آغْدَاءَ" کے الفاظ جنوں اور مظاہر قدرت کو معبودان باطل کے زمرہ سے خارج کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ان بے جان اشیاء کی نہ اس دُنیا میں دوستی کا کچھ فائدہ ہے نہ آخرت میں ان کی دشمنی کا کچھ نقصان۔ بلکہ ان چیزوں کا تو آخرت میں کوئی وجود ہی نہ ہوگا۔ اب صرف فوت شدہ بزرگ ہی رہ جاتے ہیں۔ جو اس آیت کا صحیح مصداق بن سکتے ہیں۔

(۲) احادیث صحیحہ | احادیث صحیحہ کے متن کے طوہر پر چار باتیں ملنے آتی ہیں |

۱۔ نبی اکرمؐ پر صلوة و سلام بھیجنا۔

۲۔ تیلیف بدر کا واقعہ۔

۳۔ مَرُفے کا تدفین کے بعد واپس جانے والوں کے قدموں کی چاپ چھٹنا۔ اور
۴۔ قبرستان میں جا کر مسلمانوں کو السلام علیکم دار قوم متومنین وغیرہ کہنے کا ارشادِ نبویؐ۔ ان باتوں
میں سماعِ موٹی کا احتمال موجود ہے۔ گویا احادیث صحیحہ چونکہ قائلین اور منکرین سماع کے
درمیان مشترک ہیں۔ لہذا ان کا ذکر ہم منکرین سماعِ موٹی کے دلائل میں پیش کریں گے۔

(۳) تیسرے اور چوتھے درجہ کی احادیث | ہے۔ اور یہی احادیث دلائل سماعِ موٹی کا ثبوت بل جاتا

کے قائلین کے لیے رکنِ شدید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن چونکہ یہ احادیث تیسرے اور چوتھے
درجہ کی ہیں، جو قابلِ احتجاج نہیں ہوتیں۔ شان سے کوئی حکم ثابت ہو سکتا ہے۔ لہذا ان پر تبصرہ
کرنا بیکار اور خارج از بحث ہے۔ اس طرح کی ایک دو احادیث کا ذکر آئندہ جمل کر آئے گا۔ جو
ضعیف اور مجروح ہونے کے باوجود بہت مشہور ہیں۔

(۴) بزرگوں کے اقوال | بزرگوں کے اقوال نے تو سماعِ موٹی کی بنیاد پر ایک قہرِ عظیم تیار
کر دیا ہے۔ یہ بزرگ مردوں کو یوں زندہ کرتے ہیں کہ حضرت

عیسیٰ کا معجزہ ان کی کرامات کے سامنے بیچِ نظر آنے لگتا ہے۔ ہم بتلا چکے ہیں کہ مردوں کو زندہ
کرنے کا امکان ہے مگر ان حضرات نے تو اس امکان کو اتنا عام کیا کہ عام منابط اور استثنائیں
کوئی فرق ہی نہ چھوڑا۔ مولانا مودودی صاحب نے کہا تھا کہ مسلمان کی عادت سی بن گئی ہے کہ
جہاں انھیں سُنی کے ناکرتبئی گنجائش ملی وہاں سے وہ ہاتھی گزارنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی
صورتِ حال ان لوگوں کی بھی ہے۔ سماعِ موٹی، حاجت برآری اور تعزقات امور میں ان کا
دعویٰ اللہ تعالیٰ سے کسی صورت کم تر نہیں ہوتا۔ اگرچہ زبان سے وہ یہی کہتے ہیں کہ وہ قرآن و سنت
کے متبع ہیں۔ یہ مباحث اس موقع پر خارج از بحث ہیں۔ سر و دست ہم یہی عرض کرنا چاہتے
ہیں کہ بزرگوں کے ان اقوال اور خواہوں کو ان کے بعض معتقدین بھی محنت نہیں سمجھتے۔ تو ان کو
زیرِ بحث لانا بالکل بیکار ہے۔

منکرین سماعِ موٹی اور ان کے دلائل

۱۔ قرآن | قرآن میں مذکورہ بالا تین آیات کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جن سے
لے ان کا ذکر ہم نے اپنی تصنیف "اشرفیت و طریقت" میں تفصیل سے پیش کر دیا ہے جو زیرِ طبع ہے۔

سماحِ موتی کا رد ثابت ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ہم تو یوں کہیں گے کہ قرآن کی تعلیم کے مطابق مرحلہ ۱۰ یعنی برزخی زندگی میں مردوں کے متعلق عام صوابطِ الہی یہی ہے کہ وہ سن نہیں سکتے، اس طرح کی مزید آیات کا اندراج طوالت کا باعث ہوگا۔ مقصد برآری کے لیے یہی تین آیات کافی ہیں، جو دوزخ کی جاچکی ہیں۔

۲- احادیث صحیحہ

(۱) مقتولین بدر | تالیفِ بدر یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مقتولین بدر کے خطاب کا واقعہ تقریباً تمام کتب صحاح میں موجود ہے۔ ہم اس سلسلہ میں صرف صحیح بخاری سے تین روایات نقل کریں گے (ایک حدیث کے راوی عبداللہ بن عمرؓ ہیں۔ دوسری کے حضرت قتادہؓ اور تیسری کی حضرت عائشہؓ) تاکہ معاملہ کے سب پہلو سامنے آجائیں۔ امام بخاریؒ نے یہ احادیث کتاب المغازی (غزوة بدر) میں درج فرمائی ہیں۔ اور کتاب الجنائز باب ما جاز فی عذاب القبر میں بھی۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں:

”إِظْلَمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى أَهْلِ الْقَلْبِ فَقَالَ: وَجَدْتُمْ
مَا وَعَدَكُمْ رَبُّكُمْ حَقًّا؟ فَقِيلَ لَهُ: أَتَدْعُو أَمْوَئًا. قَالَ: مَا أَنْتُمْ بِأُمَّمٍ
مِنْهُمْ وَلَكِنْ كَلَّا يُجِيبُونَ“

”جو کافر بدر کے دن اندھے کنویں میں ڈال دیتے گئے تھے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان پر جھانکا اور فرمایا: ”تمہارے مالک نے جو سچا وعدہ تم سے کیا تھا وہ تم نے پایا؟ لوگوں نے عرض کیا: ”آپؐ مردوں کو پکارتے ہیں؟“ فرمایا: ”تم کچھ ان سے زیادہ نہیں سنتے۔ البتہ وہ جواب نہیں دے سکتے“

(ب) حضرت قتادہؓ، انسؓ اور وہ ابو طلحہ انصاریؓ سے یہی واقعہ روایت کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

”قَالَ قَتَادَةُ: أَحْيَاهُمُ اللَّهُ حَتَّى أَسْمَعَهُمْ قَوْلَهُ كَوَيْبِهَا وَتَضَعِيهَا
وَنَفْسَهُ وَحَسْرَةً وَنَدَامًا. (بخاری، کتاب المغازی، ابواب غزوة بدر)

”قتادہ نے اس حدیث کی تفسیر میں یہ کہا کہ اللہ نے اس وقت ان مردوں کو جلا دیا

تھا، اُن کو جروتوزیح کرنے، ذیل کرنے، بدل لینے، انوسوں دلانے اور شرمندہ کرنے کے لیے؟

(ج) حضرت عائشہؓ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اس فہم یا اس اجتہاد کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ عبداللہ بھول گئے۔ (نسائی۔ کتاب الجنائز۔ باب عذاب القبر)

اور خود اس واقعہ کے متعلق فرمایا:

”قَالَتْ اِكْمَا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُو لَيَعْلَمُوْنَ اَلْاَنَ اَنْ مَا كُنْتُ اَقُوْلُ لَكُمْ حَقِّيْ وَقَدْ قَالَ اللهُ تَعَالٰى اِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتٰى“ (بخاری۔ کتاب الجنائز۔ باب ماجاء فی عذاب القبر)

”حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے کافروں کو صرف یہ کہا تھا کہ: میں جو ان سے کہا کرتا تھا اب ان کو معلوم ہو گا کہ وہ سچ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے (سورہ نوح میں) فرمایا کہ اُسے پیغمبر تو مڑوں کو سنا نہیں سکتا؟ ان ہر سہ امادیت سے مندرجہ ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں:

۱۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سماعِ موتی کے قائل تھے۔ گواہوں نے بھی اپنی زبان سے یہ الفاظ نہیں کہے۔ تاہم اُن کا یہ عمل تھا کہ وہ نبی اکرمؐ کے حجرہ کے باہر کھڑے ہو کر رسول اللہؐ پر، حضرت ابوبکرؓ پر اور اپنے باپ حضرت عمرؓ پر سلام کہتے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے سماعِ موتی کے قائل تھے۔

۲۔ گو آپ نے سماعِ موتی کو درست سمجھتے تھے، تاہم وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ وہ جواب نہیں دے سکتے؟ گویا اُن کے نزدیک بھی یہ سلام، سلامِ دعا یا ”سلامتی کی دعا“ تھا، سلامِ تحیّہ نہ تھا، جس کا جواب دینا فرض ہوتا ہے۔

۳۔ حضرت قتادہ اس واقعہ کو نبی اکرمؐ کا معجزہ تسلیم کرتے ہیں۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ کافروں کی زجر و توبیخ اور حسرت و ندامت دلانے کے لیے کہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی رُو میں ٹوٹا دی، تاکہ وہ یہ الفاظ سن لیں۔ یا اللہ نے براہِ راست اُن کی رُوں تک یہ الفاظ پہنچا دیئے۔

۴۔ حضرت عائشہؓ سماعِ موتی کی اس حد تک انکاری ہیں کہ آپ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اس فہم کا رد بھی کیا۔ آپ نے بھی اس واقعہ کو ایک معجزہ قرار دیتی ہیں۔ اُن کے خیال میں

ان مژدوں کو سنا دینا اللہ کا کام ہے۔ اور اس کی توجیہ وہی بیان فرمائی جو حضرت قتادہ نے فرمائی۔

اب دیکھئے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک ہجرت گزار، زاہد، متقی
حضرت عائشہؓ کا تفقہ اور صالح انسان ضرور تھے۔ مگر تفقہ میں انھیں وہ مقام حاصل
 نہ تھا جو حضرت عائشہؓ کو حاصل تھا۔ حضرت عائشہؓ سے بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ مسائل
 دریافت کرنے آتے تھے۔ ترمذی کی درج ذیل حدیث ملاحظہ فرمائیے:

”عَنْ أَبِي مُؤَيْبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: مَا اشْتَعَلَ عَلَيْنَا أَصْحَابَ
 رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدِيثَ قَطْ فَسَأَلْنَا عَائِشَةَ إِلَّا
 وَجَدْنَا عِنْدَهَا مِنْهُ عِلْمًا“ (ترمذی بکوارہ مشکوٰۃ۔ باب مناقب زلفہ البیضاء)
 ”ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ جب بھی ہم اصحاب رسول اللہ میں کسی حدیث
 کے متعلق اشکال پیدا ہوتا تو ہم اُسے حضرت عائشہؓ سے حل کرنے کو آتے تو ہمیشہ
 آپؓ کے پاس اس حدیث کا علم پایا کرتے۔“

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے تفقہ کا یہ حال تھا کہ جب حضرت عمرؓ سے ان کے بارے
 میں تعلقہ نامزد کرنے کو کہا گیا تو آپ نے فرمایا:۔

”وَاللَّهِ مَا أَرَدْتُ بَعْدَ أَوْحِيكَ كَيْفَ اسْتَخْلَعُ رَجُلًا عَجَزَ عَنِ
 طَلَاقِ امْرَأَتِهِ“ (بخاری، کتاب الطلاق)

”خدا کی قسم! میرا ہرگز ایسا ارادہ نہیں ہے۔ تجھ پر افسوس! کیا میں ایسے
 شخص کو اپنا چانشین بنا جاؤں، جسے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا طریقہ بھی
 نہیں آتا۔“

اس تقابل سے نعوذ باللہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی شان کو کم کرنا ہرگز مقصود نہیں۔ آپؓ
 کو خود رسول اللہ نے ”صالح آدمی“ کہا اور ہجرت پر پڑھنے کی ہدایت فرمائی۔ ان کی یہ فضیلت اپنے
 مقام پر ہے لیکن جہاں تک قوتِ اجتہاد کا تعلق ہے، حضرت عائشہؓ کا مقام ان سے بہت
 بلند تھا۔

گویا حضرت عائشہؓ کے اجتہاد کے مطابق رسول اللہ کے یہ کلمات زجر و توبیخ اور حسرت و

افس دلانے کے طور پر کہے۔ جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے کو دریا میں تیرنے سے منع کرتا ہے، مگر بیٹا اس کام سے باز نہ آئے اور دریا میں ڈوب کر مرنے لگے۔ پھر اس کی لاش باپ کے سامنے آئے تو بے اختیار اس کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ میں نے تجھے نہ کہا تھا کہ یہ کام نہ کرنا در نہ مر جاؤ گے۔ گویا یہ کلمات زجر و توبیخ کے طور پر رسول اللہ نے کہے اور اعجاز کے طور پر اللہ نے یہ کلمات ان مقولین بدر کو سنوا دیئے۔

۲۔ اہل قبور کو السلام علیکم کہنا | احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ مسلمان جب قبرستان میں جاتے تو "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَهْلَ الْقُبُورِ" یا "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ دَارَ قُبُورٍ مُّؤْمِنِیْنَ" کہیں۔ یہی وہ دلیل ہے جو سماعِ موتی کے قائلین کی طرف سے بڑے شدت سے پیش کی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ کسی خاص واقعہ سے بھی متعلق نہیں۔ سماعِ موتی کا انکار کرنے والوں کا موقف یہ ہے کہ یہ سلام، سلامتی کی دعا ہے، سلام تحیہ ہے ہی نہیں جو سنا جا سکتا ہو اور صبح کا جواب دینا فرض ہے۔ اس مسئلہ میں حضرت عائشہؓ کا بھی یہی موقف تھا۔ اس کی مثال بھی یوں ہی سمجھئے جیسے تشہد میں رسول اللہ پر سلام پڑھا جاتا ہے۔ یا کوئی خط لکھنے والا ابتداء میں "السلام علیکم" سے خطاب کرتا ہے۔ اس سلام کا فوری جواب دینا تو درکنار، جواب دینا بھی ضروری نہیں ہوتا۔ کوئی جواب دہانا بھی نہیں آتا۔ اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ جب رسول اللہؐ بھیجا ہوا سلام بھی اُٹھو نہیں سنتے بلکہ فرشتوں کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ عام مسلمانوں پر بھیجا ہوا سلام از خود ان تک پہنچ جائے اور وہ اُسے سن سکیں۔ ایسے سلام بھی بذریعہ خدا تعالیٰ ہی ان تک پہنچتے ہیں۔

۳۔ جو تلوں کی چاپ | دوسرا واقعہ جس سے سماعِ موتی کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ جب میت کو اس کے عزیز واقارب دفن کر کے واپس جانے لگتے ہیں تو مردہ ان کے جو تلوں کی چاپ سنتا ہے۔

یہ واقعہ بھی بیکراہ حدیث صحیحہ میں موجود ہے۔ امام بخاری نے اسے "کتاب الجنائز باب ما جازنی عذاب القبر" میں دو مقامات پر اس طرح درج فرمایا ہے:

"اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِذَا مَاتَ عَبْدٌ وَوُضِعَ فِي قَبْرِهٖ تَوَلَّى عَنْهُ اَصْحَابُهٗ اِنَّكُمْ تَسْمَعُ كَرَمَ نِعَالِهٖمَ اَنَا وَاَمَّا مَلَكَانِ فَيَقُوْدَانِهٖ فَيَقُوْلَانِ (الحديث)

”رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جب کوئی شخص مرتا ہے اور اپنی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھی اُسے چھوڑ کر جانے لگتے ہیں تو وہ اُن کے جوتوں کی چاپ سنتا ہے۔ اس وقت اُس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں جو اُسے بخلا دیتے ہیں پھر کہتے ہیں:..... (الحدیث)

اب مشکل یہ ہے کہ مردہ کے جوتوں کی چاپ سننے کا واقعہ بخاری کے علاوہ دیگر کتب صحاح میں جہاں بھی مذکور ہے تو ساتھ ہی منکر کبیر کے آنے اور سوال و جواب کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔ گویا منکر کبیر کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے اُس کی روحِ علیقین یا ستین سے نوناکر اُسے ہوش میں لایا جاتا ہے، تاکہ وہ سوالوں کے جواب دے سکے۔ اب یہ سوال و جواب کا واقعہ تو ایک اضطراری امر ہے اور خاص اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ پھر کبھی حدیث میں یہ بھی مذکور نہیں کہ وہ ان اصحاب کی باتیں بھی سنتا ہے تو اس نام واقعہ سے علی الاطلاق سماعِ موتی کیسے ثابت کیا جاسکتا

۶ ہے

اور دوسری مشکل یہ ہے کہ اس واقعہ سے بھی حسرت و افسوس کا احساس دلانے کا پہلو نکلتا ہے۔ یعنی جب عزیز و اقارب میت کو دفن کے کھدے چلے جاتے ہیں، تو اُسے یہ احساس لایا جاتا ہے کہ جن عزیز و اقارب کی وجہ سے تو مارا مارا پھرتا تھا، حتیٰ کہ حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی تمیز بھی نہیں کرتا تھا۔ دیکھ وہ اب تجھے تنہا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ لہذا اُسے صرف جملے والوں کی آہٹ تو سنا دی جاتی ہے، آنے والوں کی نہیں۔ اور نہ ہی قبر پر موجود لوگوں کی گفتگو اُسے سنائی جاتی ہے نہ ہی وہ سن سکتا ہے۔

(۱) لَا تَجْعَلُوا بيوْتَكُمْ قُبُورًا وَلَا تَجْعَلُوا

۴۔ حضور اکرمؐ پر صلوة و سلام قلبری عیندا وصلوئا علی فان صلواتکم

تُبکغنی حیث کنتم

”اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ (یعنی اُن میں نفل و نوافل پڑھا کرو) اور میری قبر کو جشنِ اجتماع نہ بناؤ اور مجھ پر درود پڑھا کرو۔ کیونکہ تمھارا درود مجھے پہنچا دیا جاتا، جہاں کہیں تم ہو یعنی قبر کے نزدیک ہو یا دُور۔

اور نِسائی میں اس درود کو پہنچانے کی تفصیل توں بیان کی گئی کہ:

(۲) مَاَنْ رَبِّكَ لَمَلِكَةٌ سَيَا حَيْنٍ فِي الْاَرْضِ مِنْ بِيَاغُوْنِي مِنْ اُمَّتِي السَّلَامُ

”اللہ تعالیٰ نے رُوح سے زمین پر سیریل فرشتے مقرر کر رکھے ہیں جو سیری امت کا سلام مجھ تک پہنچاتے ہیں؟“

اسی طرح دوسری کتب احادیث میں بھی ایسی روایات موجود ہیں۔ جو باوجود اختلافِ افعال کے اس مضمون میں مشترک ہیں۔ کہ ”امت کا صلوة و سلام فرشتوں کے ذریعہ میری اکرم تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ چاہے کہیں سے بھی پڑھا جائے؟“

یہ سب احادیث سماعِ موثق تو درکنار اس کا خلاف ثابت کر رہی ہیں۔
 علاوہ انہیں ایک روایت مشکوٰۃ (کتاب الصلوة علی النبی بعد الشہد نفس ثانی بحوالہ ابو داؤد
 اذنیہ ہقی فی الدعوات اکبیر) یوں بھی آئی ہے:

۱۰۔ مَا مِنْ أَحَدٍ يُسَلِّمُ عَلَيَّ إِلَّا رَدَّ اللَّهُ عَلَيَّ رُوحِي حَتَّىٰ أَرُدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ؛
 ”جو مسلمان مجھ پر سلام بھیجتا ہے، اللہ میری رُوح مجھ پر لوٹا دیتا ہے حتیٰ کہ میں اس کا جواب دیتا ہوں؟“

اس حدیث سے درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

- ۱۔ رسول اللہؐ اپنی قبر مبارک میں زندہ نہیں ہیں (جیسا کہ بعض لوگوں کا عقیدہ ہے)۔ آپؐ کی رُوح اعلیٰ علیین میں ہے، جہاں سے وہ سلام کا جواب دینے کے لیے لوٹائی جاتی ہے۔ مگر آپؐ قبر میں زندہ ہوں تو رُوح کے لوٹنے جانے کا کچھ مطلب نہیں چھلتا۔
- ۲۔ رُوح سلام کا جواب دینے کے لیے لوٹائی جاتی ہے سلام سننے کے لیے نہیں۔ کیونکہ مدبر بالا احادیث کی رُوح سے سلام تو آپؐ کو فرشتوں کے ذریعہ پہنچا ہی دیا جاتا ہے۔ آپؐ ان جمع شدہ سب سلاموں کا جواب اس صورت میں دیتے ہیں کہ آپؐ کی رُوح قبر میں لوٹائی جاتی ہے۔ اور آپؐ جواب دیتے ہیں۔

۳۔ رسول اللہؐ اور عام افراد امت میں فرق یہ ہے کہ انبیاءؑ کے جسم مٹی پر حرام قرار دے گئے ہیں اور یہ بات خصائصِ انبیاءؑ میں سے ہے۔ پھر جب آپؐ پر سلام و جواب کی یہ صورت ہو تو دوسروں پر اگر سلام پڑھا یا دعا کی جاتے تو ان کا سُنا اور جواب دینا ناممکن نظر آتا ہے۔ علی الاطلاق سماعِ موثق کا قبول کرنا پھر بھی محال ہے۔

اب رباؤہ سلام جو نماز میں شہد کے دوران پڑھا جاتا ہے تو یہ سلام خطاب یا سلام تشہد | سلام تحیہ ہے ہی نہیں۔ نہ ایسے سلام کو حضورؐ نے سُنا، نہ کبھی اس کا جواب دیا۔

نہ نمازیں نہ نماز کے بعد حشی کہ جب صحابہ سیکھنے کی غرض سے اونچی آواز سے یہ سلام رسول اللہ کے سامنے پڑھتے یا "السلام علیک ایہا النبی" کہتے تھے۔ جب بھی آپ نے اس کا کبھی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ یہ سلام بطور حکایت پڑھا جاتا ہے اگرچہ اس میں مخاطب رسول اللہ کی ذات ہے۔ واقعہ معراج کے دوران اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "السَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ" اور اس کے جواب میں آپ نے فرمایا: "السَّلَامُ عَلَیْكَ اَوْ عَلٰی عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِیْنَ" تو یہ کلمہ بعینہ نماز میں بطور حکم پڑھا جاتا ہے۔ یہ سلام دُعا کے طور پر ہے جس کا سننے سنانے یا جواب دینے سے کوئی تعلق نہیں۔

اس کے علاوہ بیہقی فی شعب الایمان میں ایک روایت یوں بھی آئی ہے۔ جو عوام میں مشہور ہے، نیز یہ حدیث مشکوٰۃ کتاب الصلوٰۃ باب

موضوع احادیث

الصلوٰۃ علی النبی فصل ثلث میں بھی درج ہے:

مَنْ صَلَّى عَلَیَّ عِنْدَ قَبْرِیْ سَمِعْتُهُ

"جو شخص میری قبر کے پاس مجھ پر سلام پڑھے تو میں اس سلام کو سن لیتا ہوں"

یہ روایت موضوع یا من گھڑت ہے۔ اس کا راوی محمد بن مروان السدزی کذاب اور ضلع ہے۔ جس کا کام ہی جھوٹی حدیثیں گھڑنا تھا۔ امام بیہقی نے اسی وضاع سے ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے جو اس روایت کی خود ہی تردید کرتی ہے۔ اس کے الفاظ یوں ہیں:

"مَا مِنْ عَبْدٍ يُسَلِّمُ عَلَیَّ عِنْدَ قَبْرِیْ اِلَّا وَكَلَّ اللّٰهُ بِهٖ مَلَكًا یَبْلُغُنِیْ"

"جب بھی کوئی شخص میری قبر کے پاس کھڑے ہو کر مجھ پر سلام پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ

ایک فرشتہ مقرر کر دیتا ہے جو اس سلام کو میرے پاس پہنچا دیتا ہے"

گویا اصل ما بہ النزاع مسئلہ کا اس وضاع نے خود ہی فیصلہ کر دیا۔ اس کی دوسری حدیث چونکہ دوسری صحیح احادیث کے مطابق ہے لہذا فرماں نبوی "اِنَّ الْکَذِبَ قَدْ یَصُدُّکُمْ" کے مصداق اسے صحیح قرار دیا جائے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ سلام خواہ قبر پر پڑھا جائے یا دُور سے۔ آپ کو فرشتوں ہی کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ:

نقد و نظر (۱) صحیحین کی احادیث اقل درجہ کی شمار ہوتی ہیں۔ باقی صحاح کی چار کتابوں کی احادیث دوم درجہ کی اور باقی کتب احادیث کی روایات علی قدر مراتب سوم اور چہارم درجہ کی شمار ہوتی ہیں۔ درجہ سوم اور چہارم کی اکثر احادیث ناقابل اعتماد ہیں۔

۲۔ مشکوٰۃ حدیث کی مستقل کتاب نہیں۔ بلکہ مختلف کتبِ امارت سے منتخب مجموعہ ہے۔ اس کی تدوین پہلے امام حسین بن سعید البغوی نے ۳۵۰ھ میں کی۔ اور اس کا نام مصابیح السنۃ تجویز کیا۔ اس میں ہر باب کی دو تفصیلات رکھیں۔ پہلی فصل میں صحیحین کی امارت درج کریں۔ اور دوسری میں باقی چار صحاح کی کتابوں کی۔ پھر امام محمد بن عبداللہ الخطیب نے انھوں نے صدی میں اس کو از سر نو مدون کیا۔ اس کا نام مشکوٰۃ المصابیح رکھا۔ اور اس میں ہر باب کے بعد ایک تیسری فصل کا اضافہ کیا۔ اور اس میں بلا امتیاز جو حدیث ملی، درج کر دی۔ خواہ یہ درجہ اول یا دوم سے تعلق رکھتی ہو اور پہلے درج نہ ہوئی۔ اور خواہ یہ حدیث درجہ سوم اور چہارم سے تعلق رکھتی ہو۔

۳۔ حدیث **رَدُّ الْمَطْلُوعِ رُغْمِي** میں بیہقی کے ساتھ چونکہ ابوداؤد کا حوالہ بھی آ گیا ہے۔ لہذا یہ تو فصل ثانی میں درج کر دی گئی اور موضوع حدیث سے کافصل ثالث میں اندراج بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حدیث ناقابلِ اعتماد ہے۔

۴۔ مشکوٰۃ المصابیح کی عربی شرح **مرآة المفاتیح** مولانا عبید اللہ رحمانی نے لکھی ہے۔ انھوں نے حدیث **ن۹۳** (یعنی ہماری مندرجہ حدیث سے) پر جو حواشی لکھے ہیں، ان کا لخص یہ ہے۔ (مرآة المفاتیح جز ثانی مطبوعہ مکتبہ اشریہ ساکنہ بل ص ۵، ص ۵)۔

۵۔ اس حدیث کا بھی یہی مطلب ہے کہ سلام نزدیکے دور یا دُنیلکے کسی حصے سے آپ پر بھیجا جائے وہ تمام صحیح اور مشہور امارت کے مطابق فرشتوں کے ذریعہ آپ تک پہنچایا جاتا ہے۔

ب۔ میرے (شایع کے) خیال میں رابع بات یہ ہے کہ یہ سلام صحیحاً ہے سلامِ تحیہ نہیں۔

ج۔ اس حدیث **”سَمِعْتُ“** والی ہاکی سندوں سے۔ العلاء بن عمرو۔ محمد بن مروان السدی۔ ایش۔ ابی صالح۔ ابی ہریرہ مرفوعاً۔

عقیل کہتے ہیں کہ:

۱۔ ایش والی حدیث کا کچھ اصل نہیں۔

۲۔ العلاء بن عمرو کے تعلق ابن حبان اور لازدی نے کہا کہ یہ ناقابلِ اعتماد ہے۔ اور

۳۔ محمد بن مروان السدی متروک الحدیث اور متہم بالکذب ہے۔

موضوع حدیث سے | ابن عبدالبر نے الاستذکار والتمہید میں ابن عباس سے

روایت کیا کہ:

سَامِنَ أَحَدِ كَيْسَرِ بَقْبَرِ أَخِيهِ السُّؤْمِينَ كَانَ يَعْرِفُهُ فِي الدُّنْيَا فَيَسْأَلُوهُ عَلَيْهِ
الْأَعْرَافَةَ وَرَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ؛

مکوئی بھی شخص جو اپنے موزن بھائی کی قبر پر گزرتا ہے وہ دنیا میں پہچانتا تھا۔ جب
یہ گزرنے والا شخص اس کو سلام کہتا ہے تو وہ اسے پہچان لیتا ہے اور وہ سلام کا جواب
دیتا ہے۔“

اور اسی مضمون سے جی جلیقی حدیث ابن ابی الدنیا نے زید بن اسلم سے۔ ابو ہریرہ سے
کتاب القبور میں یوں بیان کی:

”إِذَا مَرَّ الرَّجُلُ بِقَبْرِ يَعْرِفُهُ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ رَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ وَعَرَفَهُ
وَإِذَا مَرَّ بِقَبْرِ لَا يَعْرِفُهُ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ رَدَّ عَلَيْهِ“

(مصنوع السفا تیح - ج ۲ - صفحہ ۵۵ سے نقل کی گئی)

علمائے دین اور سماع موٹی | اس حدیث کے متعلق مستفسر جناب عبدالقادر سومرو
نے استفسار فرمایا۔ یہ حدیث امام ابن تیمیہ نے کتاب
الوسیلہ (مترجم صفحہ ۳۳) میں درج فرمائی۔ اور امام ابن قیم نے اپنی کتاب کتاب الروح پہلے باب
میں ابن ابی الدنیا کی کتاب القبور کے حوالہ سے درج فرمائی ہے۔ کتاب الروح۔ ترجمہ از محمد اؤد
راغب رحمانی، مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی صفحہ ۲۵) اس حدیث کے مردود ہونے کے لیے یہی بات
کافی ہے کہ اس کتاب کے مترجم ابو داؤد راغب رحمانی نے اسی کتاب کے حکلا پر ضروری بات
کے تحت یہ صراحت فرمادی کہ ”ابن ابی الدنیا کی روایتیں بلا تحقیق کے ناقابل قبول ہیں۔“ لطف کی
بات ہے کہ ایک صفحہ پر مترجم یہ ضروری بات لکھتے ہیں۔ اور سلسلے صفحہ پڑھی ابن ابی الدنیا کی
یہ روایت بل جاتی ہے۔ جس سے امام ابن قیم نے احتجاج کیا ہے۔

مستفسر جناب محمد احسان الحق صاحب نے یہ سوال بھی (سوال ۵) کیا تھا کہ کتاب الروح
لابن قیم کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ تو جواباً عرض ہے کہ امام ابن قیم اور ان کے استاد جناب
امام ابن تیمیہ دونوں بزرگ نہ صرف یہ کہ سماع موٹی کے قائل تھے بلکہ اسی طبقہ صوفیوں سے تعلق
رکھتے تھے۔ جنہوں نے اس مسئلہ کو اچھا لا اور ضعیف اور موقوف احادیث کا سہارا لے کر اس
مسئلہ کو علی الاطلاق ثابت کرنا چاہا ہے۔ امام ابن تیمیہ اور امام قیم دونوں صاحب کشف و کرات

بھی تھے۔ اور دونوں بزرگوں نے تعتوف و سلوک پر مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اگر اس طبقہ کے منجھ سے قبر اور کساح موتی کے مسئلہ کو کھینچ لیا جائے تو ان کے پاس باقی رہ گیا جاتا ہے؟

اسی طرح کے ایک تیسرے بزرگ شاہ ولی اللہ صاحب ہیں۔ یہ تینوں بزرگ جب شکر و بدعات کی تردید پر قلم اٹھاتے ہیں، تو جی عیش عیش کراٹھتا ہے۔ اور ہم دل و جان سے ان کی دینی خدمات کے معترف ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب یہ زیارات قبور کے آداب اور کشف کے طریق بتلاتے ہیں تو نہیں سوچتے کہ آیا قبروں اور مزارات کے وجود کا بھی کوئی مواز ہے یا نہیں یا قبروں پر اس غرض سے بیٹھنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ ہر مردوں کو سنانا اور ان سے سنانا تو دوسری باتیں ہیں۔ ان سب باتوں کی کتاب و سنت نے پُر زور تردید کر دی ہے۔

یہ تو خیر متفسرین کے سوالوں کے جواب تھے۔ اب زیر بحث حدیث کی طرف آئیے۔ جو یہ کہتی ہے کہ مردہ اگر سلام کہنے والے کو پہچانتا ہے۔ تو جواباً اس پر سلام بھی کہتا ہے۔ اور اگر نہیں پہچانتا تو حیرت اسے لوٹا دیتا ہے۔ اور ایسی طرح بعض دوسری روایتوں میں یہ بھی ہے کہ مردہ اپنے واقف کے آنے سے خوش ہوتا ہے۔ اور اس کے بار بار آنے سے ہلنے سے مانوس ہو جاتا ہے۔

اب ایسی احادیث سے صحت ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

جھلی حدیث کے نتائج | (۱) قبرستان میں ہر طرف مرفے ہی نہیں بلکہ رُوحیں بھی ہر وقت موجود

رہتی ہیں اور وہ ان کے بدلوں میں ہوتی ہیں (عقین یا سقیم میں نہیں ہوتیں)

(۲) ان مُردوں میں شعور بھی ہوتا ہے اور شعور کا تعلق صُوح سے ہے بدن سے نہیں۔ اس سے

معلوم ہوا کہ مُردوں کے اجسام میں رُوحیں موجود ہوتی ہیں۔ یعنی وہ قبوں میں زندہ ہوتے ہیں۔

(۳) وہ سلام وغیرہ سنتے ہی نہیں بلکہ اس کا جواب بھی دیتے ہیں۔ اور چونکہ یہ سوال و جواب قبر

پر ہوتا ہے۔ لہذا اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ قبوں میں مُردے نہیں بلکہ زندہ اور باشعور

انسان تشریف رکھتے ہیں۔

اور یہ وہ بنیاد ہے جس کی طبقہ صوفیاء کو ضرورت تھی۔ لیکن قرآن ان کی ایک ایک بات

کی پُر زور تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ذور موت کا دور ہے زندگی کا نہیں۔ قبروں میں پڑے

ہوتے لوگ مُردہ ہیں، ان میں شعور ہے، نہ یہ سن سکتے ہیں نہ جواب دے سکتے ہیں۔ اب دیکھا

راستے ہیں۔ یا تو ان اماموں اور بزرگوں کی روایات اور اقوال اور کاشفات کو مان لیجئے اور قرآن و متنبوار ہو جائیے۔ ورنہ ان سب خرافات سے دستبردار ہونا پڑے گا۔

اللہ تعالیٰ نے جو استثنائی صورت بیان فرمائی کہ "اللہ اگر چاہے تو مردوں کو سنا سکتا ہے؟" اس مسئلہ سے اس قدر گنجائش نکالنا کہ قرآنی تعلیمات کے بالکل برعکس ہو جائے۔ آخر کہاں تک گوارا کیا جا سکتا ہے؟

کتاب الترویج اور سماع موثیٰ | اس کتاب کا آغاز سماع موثیٰ پر بحث سے ہوتا ہے۔ لیکن تیز

سے ہوتا ہے جسے ہم نے ممنوع حدیث کے تحت مدح کیا ہے، اس کے بعد قلبی بدوالی حدیث درج فرمادے۔ لیکن اس پر حضرت قتادہ یا حضرت عائشہؓ کا تبھو چھوڑ دیا گیا ہے۔ بعد ازاں "السلام علیکم ذاکم مؤمنی منین" کی روایت درج ہے۔ اور پھر ابن ابی الدنیا کی روایات مذکور ہیں۔ جس کے متعلق کتاب الترویج کے مترجم محمد داؤد رافضی رحمانی پہلے ہی مطلع کر چکے ہیں کہ "ابن ابی الدنیا کی روایتیں بلا تحقیق کے ناقابل قبول ہیں؟ یہ پانچ روایات درج کرنے کے بعد بزرگوں کے اقوال اور خوابوں کے واقعات کا لائقناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے آپ خود ہی اندازہ فرمائیے کہ کتاب و سنت کے معیار پر یہ کس قدر تحقیقی کتاب کہلاتے جانے کی مستحق ہے۔

امام ابو حنیفہؒ | حیرت کی بات ہے کہ سماع موثیٰ اور اسی طرح سلوک و تصوف خفیوں اور امام ابو حنیفہؒ کے متعلق مشہور واقعہ ہے کہ آپ نے کسی شخص کو ایک قبر پر صاحب قبر کو جارتے دیکھا تو کہنے لگے:

"تجھ پر بھٹکا رہا اور تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں، تو ایسے اجساد سے بات کرتا ہے جو آواز سن سکتے ہیں نہ جواب دے سکتے ہیں اور نہ ہی کچھ اختیار رکھتے ہیں؟"

پھر قرآن کی یہ آیت پڑھی: "وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُورِ"

بائیں ہمہ سماع موثیٰ کی بنیاد پر پھیلنے والے دوسرے شرکیہ عقائد کی سرپرستی کا حق جس قدر فرقہ بریلویوں نے ادا کیا ہے کسی نے کم ہی کیا ہوگا۔ دوسرے نمبر پر دیوبندی حضرات ہیں اور ہمیں انہوں سے کہنا بحدیث بھی اس میدان میں کچھ نہیں رہے۔ حقہ رسد انہوں نے بھی یہ

علامہ وحید الزمان | متاخرین میں ایک عالم شخصیت علامہ وحید الزمان ہیں۔ یہ پہلے شیعہ تھے، پھر حنفی ہوئے۔ پھر اہلحدیث ہوئے۔ تاہم کچھ نہ کچھ سابقہ اثرات طبیعت میں باقی رہ گئے۔ مثلاً آپ آخر عمر تک فضیلت علیؑ کے قائل رہے۔ اور جہاں کہیں یزید کا نام آیا تو یزید پر لید لکھا۔ آپ جب حنفی تھے تو سماع موٹی کے قائل تھے۔ اہلحدیث ہوئے تو بھی قائل بن گیا ہے۔ پھر اس سماع موٹی کے مسئلہ میں آپ کو امام ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ سے تائید بھی مل گئی۔ تو اس سماع موٹی کے جواز کا خوب پرچار کیا۔ آپ نے قرآن کی تفسیر موضح القرآن بھی لکھی۔ صحاح ستہ کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ لغات الحدیث بھی لکھی۔ تو جہاں کہیں آپ کو اس مسئلہ کو زیر بحث لانے کا موقع ملتا رہا آپ اسی طرح کا انداز اختیار کرتے رہے۔ حیدرآباد کے کتاب الرجوع کے حصے سے متعلق پیش کردہ کتب میں۔ ہم یہاں لغات الحدیث سے سماع موٹی کے متعلق آپ کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس مسئلہ میں آپ کا طرز استدلال کس قدر سطحی اور جانبدارانہ تھا۔

” اِنَّكَ لَا تَسْمَعُ الْمَوْتِي “

” تو مردوں کو (یعنی کافروں کو) اسلام نہیں قبول کروا سکتا۔“

اس آیت سے سماع موٹی کی نفی نہیں نکلتی۔ جیسے حضرت عائشہؓ نے خیال کیا، کیونکہ سماع سے یہاں سماع اجابت مراد ہے۔ جیسے اسمع غید مسمع میں۔ اور متعدد امامدیش سے سماع موٹی ثابت ہے جیسے اوپر گزر چکا۔ اور اہل حدیث کے بڑے بڑے امام جیسے ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ اسی کے قائل ہیں۔ صرف حنفیہ اور معتزلہ نے اس کا انکار کیا۔ مجمع البحار میں ہے کہ ” اِنَّكَ لَا تَسْمَعُ الْمَوْتِي “ کا معنی یہ ہے کہ ” تو ان جاہلوں کو نہیں سمجھا جا سکتا، جن کو اللہ تعالیٰ نے جاہل بنا دیا ہے۔“

(لغات الحدیث، ردیف س ص ۱۲۳)

اس اقتباس پر تبصرہ کرنے کی ہمیں مزدورت نہیں۔ کیونکہ علامہ صاحب کے ان دلائل کے

متعلق ہم پہلے ہی بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔

۱۔ جب ترجمہ ہی بدل دیا تو نفی نکل بھی کیسے سکتی ہے؛ پھر ترجمہ بدل دینے کے بعد از سر نو سماع موٹی کا ذکر ویسے ہی کھکتا ہے۔

اللہ کا نکر ہے کہ اہم حدیث مذکورہ کا منقذ ہے اور نہ علامہ کا۔ وہ ان بزرگوں سے استفادہ
 کر سکتا ہے۔ مگر روشنی براہ راست کتاب و سنت سے حاصل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو
 اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

سماع موتی اور مولانا مودودی مرحوم

مولانا مرحوم نے سورۃ احقاف کی آیات ۲۵-۲۶ (جو ہم آیت ۲۵ کے تحت مدح کر چکے ہیں)
 کے تحت بڑا جامع اور بعیرت افروز حاشیہ لکھا ہے جس میں قرآنی آیات کا صحیح مفہوم،
 کی صورت، صحیح احادیث کا لبت لباب سب کچھ آجاتا ہے۔ اور اکثر اشکال بھی دور ہوتے ہیں۔
 ان کا یہ بیان مدح ذیل ہے:

یعنی ان پکائے والوں کی آواز سرے سے پہنچتی ہی نہیں۔ زندہ خود اپنے کانوں
 سے سن سکتے ہیں، نہ کسی ذریعہ سے ان تک یہ اطلاع پہنچتی ہے کہ دنیا میں انہیں
 کوئی پکار رہا ہے۔ اس ارشاد الہی کو تفصیلاً یوں سمجھئے کہ دنیا بھر کے مشرکین اعدا کے
 ہوا جن ہستیوں سے دعائیں مانگتے رہے ہیں۔ وہ تین اقسام پر منقسم ہیں۔ ایک
 بے روح اور بے عقل مخلوقات، دوسرے وہ بزرگ جو گرد پکے ہیں۔ تیسرے وہ
 گمراہ انسان جو خود بھی بگڑے ہوئے تھے اور دوسروں کو بھی بگاڑ کر دنیا سے نصرت
 ہوتے پہلی قسم کے معبودوں کا تو اپنے مابدول کی دعاؤں سے بے خبر رہنا ظاہر
 ہی ہے۔ یہی دوسری قسم کے معبود، جو اللہ کے مقرب بندے تھے تو ان کے خیر
 رہنے کے دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کے ہاں اس عالم میں ہیں، جہاں انسانی
 آوازیں براہ راست ان تک نہیں پہنچتیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ ادا اس کے دشمنے
 بھی ان تک یہ اطلاع نہیں پہنچاتے کہ جن لوگوں کو یہ بزرگ ساری عمر اللہ سے
 دُعا مانگنا سکھاتے رہے تھے۔ وہ اب الٹی آپ (اس بزرگ) سے دعائیں مانگ
 رہے ہیں۔ اس لیے کہ اس اطلاع سے بڑھ کر ان کو صدمہ پہنچانے والی کوئی چیز
 نہیں ہو سکتی۔ اور اللہ اپنے ان نیک بندوں کی ارواح کو اذیت دینا ہرگز پسند
 نہیں کرتا۔ اس کے بعد تیسری قسم کے معبودوں پر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ ان کے
 بھی بے خبر رہنے کے دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ملاموں کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی

مولانا رحیم ہیں بندہ میں جہاں دنیا کی کوئی آواز نہیں پہنچتی۔ دوسرے یہ کہ اللہ اور اس کے فرشتے بھی انھیں یہ اطلاع نہیں پہنچاتے کہ تمہارا مشن دنیا میں خوب کامیاب ہو رہا ہے۔ اور لوگ تمہارے پیچھے تمہیں معبود بنائے بیٹھے ہیں۔ اس لیے کہ یہ خبریں ان کے لیے مسرت کا موجب ہوں گی اور خدا ان کو ہرگز خوش کرنا نہیں چاہتا۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو دنیا والوں کے سلام اور ان کی دعائے رحمت (جیسے قبر پر یا نماز میں) پہنچا دیتا ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں ان کے لیے فرحت کا موجب ہیں۔

اسی طرح وہ مجرموں کو دنیا والوں کی لعنت اور پھٹکانا اور زبرد تو بیخ سے مطلع فرما دیتا ہے۔ جیسے جنگ بدر میں اہلے جانے والے کفار کو ایک حدیث کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تو بیخ سنا دی گئی۔ کیونکہ ان کے لیے یہ اذیت کا موجب ہے۔ لیکن کوئی ایسی بات جو صالحین کے لئے رنج کا موجب یا مجرمین کے لیے فرحت کا موجب ہو، ان تک نہیں پہنچاتی جاتی۔ اس تشریح سے سماع موتی کے مسئلے کی حقیقت، بخوبی واضح ہو جاتی ہے؟

مسئلہ سماع موتی کی پشت پناہی | مندرجہ بالا تصریحات سے یہ نتیجہ نکالنا چنداں مشکل نہ ہوگا کہ قرآن اس مسئلے کی پر زور تردید کرتا ہے۔ احادیث صحیحہ کو سامنے رکھ کر اگر فریقین کے دلائل کا موازنہ کیا جاسے تو بھی حضرت عائشہؓ کے دلائل راجح معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود بعد کے ادوار میں اہمت کے ایک بڑے طبقہ نے سماع موتی کے مسئلے کو درست سمجھا۔ یہ طبقہ دوسری صدی میں مسلمانوں کا زیادہ کا طبقہ کہلاتا تھا۔ بعد میں گو وہ صوفیاء کہلانے لگا۔ اس طبقہ کا سارا کاروبار ہی سماع موتی کی بنیاد پر قائم ہے۔ یہ مزادات، پتے کشیاں، زیارات و مکاشفات، یہ حاجت روائیاں اور تعریفات اور غرض جتنی اس طبقہ کے سماع موتی کے مسئلے کی پشت پناہی اور حفاظت کی ضرورت ہے اور کسی مسئلے کی نہیں۔ اگر قبر میں پڑے ہوئے بزرگ قبر پر بیٹھ کر مراقبہ کر لے داسے بزرگ کی بات ہی نہ سن سکیں یا کسی مسائل کی یہ بزرگ درخواست سن ہی نہ سکیں تو آگے کام کیسے چل سکتا ہے؟ یہ طبقہ اس بات سے بے نیاز ہے کہ عام مٹھے ملتے ہیں یا نہیں؟ انھیں اس معاملے سے کوئی غرض نہیں، انھیں اگر غرض ہے تو صرف یہ کہ ان کے بزرگ

مردوں کو ضرور سنا چاہیے۔

اب دیکھئے صحابہؓ میں اختلاف صرف اسی ایک مسئلہ سماعِ موٹی کے مسئلہ پر ہی نہیں ہوا۔ اور بھی کئی مسائل میں ہوا ہے۔ مثلاً حضرت عمر فاروقؓ سے اس بات کے قائل نہ تھے کہ اگر پانی نہ لے تو تہنی شخص صرف تیمم سے بھی پاک ہو سکتا ہے۔ اور حضرت عمار بن یاسرؓ نے اس سلسلہ میں اپنا ذاتی واقعہ بھی پیش کیا اور کہا کہ میں خود ایک دفعہ رسول اللہ کے ہم سفر تھا کہ منی ہو گیا۔ پانی نہ ملا تو منی میں لوٹ پوٹ لگائی۔ پھر منی اکرم سے واقعہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا کہ صرف اتنا کر لینا ہی کافی تھا۔ (یہ کہتے ہوئے) آپ نے دونوں ہاتھ زمین پر ماسے اور اپنے چہرہ مبارک اور ہاتھوں کو مسح کیا۔ حضرت عمر نے حضرت عمار بن یاسر کے اس بیان کو تسلیم نہیں کیا اور کسی واضح ضعف کے سبب جہاں کو اس روایت میں نظر آیا، ان کے نزدیک یہ روایت دلیل نہ ٹھہری۔

مگر دوسرے اختلافی مسائل کا یا تو بعد میں اختلاف ختم ہو گیا۔ جیسا کہ حدیث بالا منی کے تیمم کے درست ہونے کو بعد کے آدوار میں سب نے تسلیم کر لیا۔ یا اگر ہا تو اسی حد تک جس حد تک کو صحابہؓ میں تھا۔ مثلاً صبح کی نماز کی سنتیں اگر تقنا ہو جائیں تو وہ نماز کے فوراً بعد پڑھی جا سکتی ہیں۔ یا سوچ سکتے کے بعد ہی پڑھی جائیں؛ لیکن سماعِ موٹی کا مسئلہ ایسا ہے کہ جو دور صحابہؓ میں تو معمولی قسم کا اختلافی مسئلہ تھا مگر بعد کے آدوار میں یہ سنگین اور بنیادی قسم کا مسئلہ بن گیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ایک فرقہ کے وجود کا انحصار ہی سماعِ موٹی کے اثبات پر تھا۔

پھر کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جو مردوں ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی کوئی بات بھی نہیں کرتا۔ مثلاً یہ بات کہ مرنے سے بولتے ہیں؛ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ جب مردہ نہلا کر کھٹا پر رکھا جاتا ہے تو اگر وہ نیک ہو تو قَدْ مَوْتِي قَدْ مَوْتِي یعنی مجھے ہلدی لے چلو ہلدی لے چلو کہتا ہے۔ اور اگر بد ہے تو کہتا ہے کہ مجھے کہاں لے جا ہے ہو وغیرہ۔ لیکن کبھی آپ نے سنا ہے کہ یہ مسئلہ بھی زیر بحث آیا ہو؛ اگر زیر بحث آتا ہے تو وہی مسئلہ جو قبر پرستی اور شرک کی بنیاد ہے جس سے ایک طبقہ کا کاروبار بھی وابستہ ہے اور معاش بھی۔ باوجود اس بات کے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس کی پر زور تردید فرمائی تھی، لوگوں نے اس کی راہ نکال لی۔

۱۵، فقہی اختلافات کی اصیبت۔ شاہ ولی اللہ دہلوی۔ ترجمہ و نشر و اشاعت۔ علامہ اکیڈمی لاہور۔ ۱۹۷۹ء۔ طبع اول ۱۹۷۹ء

چوتھا مرحلہ :- آخری زندگی

یہ مرحلہ بعثت بعد الموت سے لے کر ابتداء تک مشتمل ہے۔ یہ دور کمال اور مستقل زندگی ہے۔ نبی صبح کو جو جسم اس دور میں مہیا کیا جائے گا اس کی شکل و صورت وہی ہوگی جیسی اس دنیا میں تھی۔ آرزو سب لوگ خواہ جنتی ہوں یا دوزخی ایک دوسرے کو اسی وجہ سے پہچانتے ہوں گے کہ ان کی خشکیں اور صحت میں بالکل وہی ہوں گی جو اس دنیا میں تھیں۔ البتہ بعض احادیث سے یہ ثابت ہے کہ اس دور میں جو جسم رُوح کو عطا کیا ہلتے گا۔ اس کا سائز اس جسم سے بہت بڑا ہوگا جو اسے دنیا میں دیا گیا تھا۔

اس دور کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ تمام بنی آدم اپنے اعمال کی بنیادوں پر گرد ہوں میں تقسیم ہوں گے۔ اس دور میں استثنائی صورت یہ ہے کہ دوزخی لوگ تو عذاب کی صعوبت میں ہرگز موت و حیات سے دوچار ہوتے رہیں گے۔ جبکہ جنتی لوگوں کے لیے کسی استثنائی صعوبت کا ذکر نہیں۔

اس دور میں جنتی لوگ اپنے رب کے دیدار سے مشرف ہوں گے۔ وہ اس دن اللہ تعالیٰ کو ایسے دیکھیں گے جیسے اس دنیا میں بدر کو دیکھ سکتے ہیں اور کوئی اڑھن محسوس نہیں ہوگی۔ جیسا کہ ہم اپنے سابقہ مضمون میں بتلا چکے ہیں کہ ان احادیث کی روشنی میں نہ کہیں تنازع کی گنجائش ملتی ہے نہ رُوح اعظم یا رُوح کلی کی اور نہ ہی واصل باللہ، فنا فی اللہ، واصل بحق کی یا ایسے ہی کسی کی ذات میں اللہ کے حلول کرنے کی۔ سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے رُوح کے یہ چاروں مراحل بیان کرنے کے بعد فرمایا: **ثُمَّ أَلَكِيهٖ تَتَجَعَّوْنَ**؛ آیت کے یہ آخری الفاظ ایسے تمام باطل نظریات کو رد کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اور اس **ثُمَّ أَلَكِيهٖ تَتَجَعَّوْنَ** کے ضابطہ ماہی میں کوئی استثناء بھی نہیں ہے۔

ارواح کی بین المراحل پیش رفت اور مراجعت

ہم رُوح کے چاروں مراحل کی ترتیب اور ان مراحل میں اگر کسی میں کچھ مثبتیات ہیں تو ان کا جائزہ ہم پیش کر چکے ہیں۔ اب ہم ایک ایسے استثناء کا ذکر کریں گے جو مرحلہ اول کو برے سے ہی صاف کر دیتا ہے۔

شہداء کی زندگی | روح کے اس تدریجی سفر میں شہداء کی فضیلت یہ ہے کہ ان سے مراد نہ صرف مدفن کر دیا گیا ہے۔ ان کی قبریں سنگ مرمر کے ذریعہ جامع ہوتی ہے۔ اور بعض صبح و شام ان پر بخت کی طرف سے روزانہ کھتا ہے۔ بلکہ وہ شہید ہوتے ہی سیدھے مرحلہ ۱۰ میں یعنی جنت میں چلے جاتے ہیں۔ یہ فرق البتہ ضرور رہ جاتا ہے کہ جنت میں ان کو سبز پندوں کا جسم عطا کیا جاتا ہے۔ حالانکہ مرحلہ ۱۰ میں ادراج کو اسی شکل و صورت کے اجسام مہیا کئے جاتے ہیں جو مرحلہ ۱۰ یعنی دنیوی زندگی میں تھے۔

اس سے یہ اندازہ لگانا بھی درست ہے کہ انبیاء جو شہداء بھی ہوتے ہیں۔ اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ ان کی بھی قبریں جامع نہ ہو۔ اور اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ جن باتوں کی جامع ہوتی ہے ان کے معلق تو وہ خود ہوتے ہیں، لہذا ان کی جامع کیسے؟ ان کی ادراج بھی اعلیٰ علیین میں ہوتی ہیں۔ انبیاء کی دوسری خصوصیات یہ ہیں (۲) ان کے اجسام میں پر حرام ہیں اور (۳) وہ غضاب قبر کی آواز سن لیتے ہیں دوسرا کوئی نہیں سن سکتا۔

روحوں کی واپسی | عام منابطہ الہی کے مطابق روح کا پچھلے مرحلہ کی طرف واپسی کا کوئی قانون نہیں۔ جو مدخل سجین میں ہیں، وہ تو اس لیے دنیا میں واپس نہیں آسکتے کہ وہ اللہ کی محالات میں مقید ہیں۔ اور جو مدخل علیین یا اعلیٰ علیین (جنت) میں ہیں، وہ جو مرحلہ کی طرح مقید تو نہیں، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ جنت کی نعمتیں یا بلند مقام چھوڑ کر آخر زمین کی طرف کیا لینے آئیں گی؟

اس قانون میں استثناء صرف یہ ہے کہ جب فرشتے کسی انسان کی، خواہ نیک ہو یا بد، روح قبض کرتے ہیں۔ تو وہ مدخل سجین یا علیین میں رکھی جاتی ہے۔ پھر اس وقت اس کے جسم کی طرف لوٹائی جاتی ہے۔ جب اس کے عزیز و اقارب اس کے دفن کرنے کے بعد واپس جا رہے ہوتے ہیں۔ مدخل کا اس وقت لوٹنا ایک انتہائی اہم ہے۔ کیونکہ جامع ہر انسان سے کی جاتی ہے، اس لئے شہداء اور انبیاء کے۔

اس آرائش کے بعد بھی مدخل سجین اور علیین میں رہتی ہیں۔ ان مدخلوں کو انہی مقامات پر رہنا ہوتا ہے اور اس کی کیفیت وہی ہوتی ہے جو مرحلہ ۱۰ میں خواب میں ہوتی ہے۔ پھر کبھی کبھی اس غضاب و خواب میں کچھ اضافہ کی خاطر روح کو بدن کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ روح کی یہ حیثیتا ناجائز بدن کی طرف بازگشت بھی ایک انتہائی اہم ہے۔ اسی گاہے گاہے بازگشت کو

قرآن میں صبح و شام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور یہ اضافہ بدن کی شرکت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے خواب میں کسی شدید واقعہ سے سونے والے کا بدن بھی متاثر ہو جاتا ہے۔
 لہذا یہ معاملہ کہ رُوح میں مرید و عابد یعنی طہیقین اور سچّین سے اپنی قبروں پر تشریف لائیں۔ یا ان سے مسلسل رابطہ قائم رکھیں یا اپنی قبروں پر عکس ڈالتی رہیں تاکہ جو کوئی انھیں آکر سلام کہے، وہ اس کے سلام کو سن کر اُس کا جواب دیں۔ تو حاشا! وکلّا ان میں کوئی بات بھی ردّوں کے اختیار میں نہیں ہے۔
 لیکن ہمارے تقویٰ زدہ طبقہ نے نہرِ زمین ایک نئی دنیا آباد کر رکھی ہے۔ ان کے نزدیک عام آدمی نہیں تو کم از کم بزرگ حضرات اپنی اپنی قبروں میں اسی طرح زندہ ہیں جس طرح اس دُنیا میں زندہ تھے۔ البتہ ان بزرگوں میں اب تصرف فی الامور کی قدرت دینا کے لحاظ سے کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ گویا اس دنیا کے جملہ اہتمامات اپنی فوت شدہ بزرگان کو تفویض کر دیئے گئے ہیں۔
 یہ بزرگ لوگوں کی فریاد سنتے بھی ہیں۔ اور اس تکلیف کو دور کرنے کی بھی طاقت رکھتے ہیں۔

اور رسول اللہ تو قبر میں دنیا کی طرح زندہ رہنے کے اور بھی زیادہ حقدار ہیں کیونکہ دُنیا بھر کے مسلمان آپ کے روضہ پر جا کر سلام پڑھتے ہیں۔ اور ان کا آپ کو جواب دینا ہوتا ہے۔ اور جب تک قبر میں زندہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ وہ سلاموں کا جواب کیونکر دے سکتے ہیں؟ قرآن نے تو کہا تھا کہ "إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ" مگر یہ حضرات بھلا ہیں کہ رسول اللہ کی ذات تو بڑی دُور کی بات ہے۔ ہمارے اولیاء بھی قبروں میں زندہ موجود ہیں۔ موت اُن کے لیے صرف ایک پردہ ہے۔ بس جو نبی قبر میں پہنچتے اور دُنیا والوں کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں تو ان میں یکدم دنیوی زندگی عود کر آتی ہے۔ اور کسی عاشقِ رسول نے تو یہاں تک بھی کہہ دیا کہ قبر میں رسول اللہ کے وہی اعمال و اشغال ہوتے ہیں جو اس دُنیا میں ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ قبر میں ان پر ازواجِ مطہرات بھی پیش کی جاتی ہیں۔ نعوذ باللہ من ذلہ و اہوالہ۔

نگاہِ بازگشت

(۱) رُوح اللہ کی مخلوق ہے۔ حادث ہے۔ قدیم نہیں۔ اور چونکہ مخلوق ہے، لہذا کسی نہ کسی وقت فنا سے دوچار بھی ہوگی۔ بموجب ارشادِ باری تعالیٰ:

”مَنْ مِّنْكُمْ مَّرَّ بِمَا فَتِنَا لَكُمْ فَلْيَلْزِمُوا الْإِكْلَامَ“

(المؤمن: ۲۶-۲۷)

”ہر چیز جو اس کائنات میں ہے فنا ہونے والی ہے۔ موت تیرے بزرگ بڑے پروردگار کی ذاتِ باقی رہ جائے گی۔“

۲۔ روح پر چار مراحل آتے ہیں۔ دوسرے مرحلے میں جا کر نئے بدن قلمبے جو آکر کار کا کام دیتا ہے، کیونکہ یہی عرصہ دارالاستحسان ہے۔ تیسرے مرحلے میں روح سے بدن کا آسرا نصیب لیا جاتا ہے اور چوتھے مرحلے میں روح کو نیا بدن عطا کیا جاتا ہے۔ تاکہ مرحلہ نئے کے اعمال کا بدلہ روح اور بدن بل کر جگت سکیں۔

۳۔ ان چاروں مراحل میں روح زندہ ہی رہتی ہے۔ اور روح ہی وہ شے ہے جو عقل و شعور اور اولادہ و امتیاز رکھتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود زندگی کا دور وہ ہوتا ہے جب روح کر بدن بھی نصیب ہوتا ہے۔ بدن اگرچہ بے جان بہت ہلکا ہوتا ہے مگر دل اور عقل و شعور یا اولادہ و امتیاز سے ماری ہے۔ تاہم زندگی کا ایک لازمی عنصر ہے جس مرحلے میں روح کو بدن نصیب نہ ہو وہ موت کا دور کہلاتا ہے۔

۴۔ ان چاروں مراحل میں روح چونکہ زندہ رہتی ہے۔ لہذا چاروں مراحل میں زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ آثار چونکہ مدح و بدن کے انصال والی زندگی کی نسبت نہایت کمزور ہوتے ہیں۔ لہذا ان ادوار یعنی مرحلہ ۱ اور مرحلہ ۲ کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۵۔ جن ادوار میں زندگی ہی غالب ہے یعنی مرحلہ ۱ اور مرحلہ ۲، ان میں بھی موت کی استثنائی صورتیں پائی جاتی ہیں۔ جیسے اچھلنے موٹی بطور خرق عادت اور خواب بطور عام مضابطہ الہی۔ تاہم یہ موت کے کمزور سے آثار غیر مسلسل اور غیر مستقل ہوتے ہیں۔

۶۔ بعینہ موت کے دور یعنی مرحلہ ۳ میں بھی استثنائی صورتوں میں زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ آثار حقیقی زندگی کے مقابلہ میں نہایت کمزور ہوتے ہیں۔ جیسے عذاب قبر جو آخرت کے عذاب کے مقابلہ میں ہلکا اور غیر مسلسل ہوتا ہے۔ اور سماج موٹی کا مسئلہ بطور خرق عادت ہے۔ جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کسی مردہ کی روح کو شاد دیتا ہے۔ اس میں اس مردہ کی روح کے ارادہ و اختیار کو کچھ دخل نہیں ہوتا۔

۷۔ مرحلہ ۳ میں روح کا مستقر علیٰ زمین یا ستمین ہے۔ اس مرحلے میں عذاب و ثواب قبر کا تعلق براہ راست روح سے ہوتا ہے۔ اور یہ عذاب و ثواب آخرت کی نسبت ہلکا اور غیر مسلسل ہوتا ہے۔ پھر کبھی کبھی یہ عذاب بواسطہ روح جسم تک بھی پہنچ جاتا ہے۔

۸۔ شہداء اور انبیاء سے مرحلہ ۳ حذف کر دیا گیا ہے۔ اس دور میں بھی ان پر موت کے بھلے زندگی کے آثار غالب ہوتے ہیں۔ لیکن یہ زندگی دنیاوی زندگی کی طرح نہیں ہوتی۔ اس زندگی

کی کیفیت کو سمجھنا ہمارے شعور سے ماورا ہے لہذا ہم ان کی اس زندگی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

۹۔ رسول اللہ پر صلوة و سلام، دُور سے ہو یا قبر پر، صیغہ فاعب سے جو مخاطب سے غائب یا فرشتوں کے ذریعہ آپ تک پہنچایا جاتا ہے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ آپ پر سلام کہنے والے کو حجاب دیں۔ یہ سلام امت کی طرف سے اجتماعی طود پر فرشتوں کے ذریعہ پہنچاتے جاتے ہیں۔ اودا سی طرح آپ اجتماعی طود پر حجاب کے طور پر امت کے لئے سلام کہتے یا سلامتی کی دعا کہتے ہیں۔ کیونکہ راجح قول یہی ہے کہ آپ پر جو سلام و صلوة کہا جاتا ہے۔ وہ سلام دعا ہے نہ کہ سلام تحیۃ۔ اسی طرح قبرستان میں جا کر مسلمانوں کو جو اتسلام علیکم کہا جاتا ہے۔ وہ بھی سلام دعا ہے، سلام تحیۃ نہیں۔

۱۰۔ قرآن سماح کی پر زور تردید کرتا ہے۔ صحیح احادیث استثنائی صورت پیش کرتی ہیں۔ ضعیف اور وضعی احادیث سماح سنی کا جواز ثابت کرتی ہیں۔ اور بزرگان کرام کے اقوال اہل ان کی خواہیں اس جواز کو تائید مزید بخشتی ہیں۔ اب مشکل یہ ہمیش آتی ہے کہ اہل بزرگان کرام کا احرام ٹھوکر کہ یہ سب درست تسلیم کر لیا جاتے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جعلی احادیث اور بزرگوں کی خواہیں اور اقوال و اعمال قرآنی آیات کا رد پیش کر رہے ہیں۔

بُردا عنہدی و لا تُدر اعلم بالصلوة!



برزخی قبر اور برزخی جسم سے تعارف

مسئلہ
(۱)

روح۔ مقام قبر۔ سماع موتی

(یہ جوابات محدث رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ میں شائع ہوئے)

مقالہ مذکورہ کی اشاعت کے بعد مجھے تین حضرات کی طرف سے خطوط موصول ہوئے۔ ان میں مختصر خط تو جناب اسحاق صاحب (مدینہ منورہ) کا تھا۔ جنہوں نے ایک موضوع حدیث کی نشان دہی فرمائی اور جس کا ذکر پیش لفظ میں تفصیل سے کر دیا گیا ہے۔ ہم اس نشان دہی کے لیے آپ کے مشکور ہیں۔ یہ حدیث چونکہ محض تائیداً درج کی گئی تھی، لہذا اس کتاب سے خارج کر دی گئی ہے۔

باقی دو حضرات کے خطوط خاصے طویل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرات ڈاکٹر کیمپٹن مسعود عثمانی (توحید رڈ۔ کیمٹری۔ کراچی) کے نظریات برزخی قبر، برزخی مقام اور برزخی جسم سے کافی متاثر ہیں۔ پھر اسی مرکزی نقطہ نظر کے مطابق کچھ سوالات، کچھ اشکالات، کچھ اعتراضات پیش کیے گئے ہیں۔ ان خطوط کو سن و عن درج کرنا تو بہت طوالت کا باعث ہوگا، میں مختصر ان کے سوالات یا

اشکالات کو پیش کروں گا، اس اعتیاد کے ساتھ کہ ان کا اصل مفہوم اوجھل نہ ہونے پڑے۔ پھر ان کے جوابات عرض کروں گا۔ وما توفیقی الا باللہ۔

ان میں سے پہلے مستفسر توجناہ شاہ فاروق ہاشمی صاحب (ٹیچر گورنمنٹ پرائمری سکول قائد آباد۔ ضلع خوشاب) ہیں۔ ان کا خط سب سے پہلے موصول ہوا اور سب سے زیادہ طویل ہے۔ انہوں نے اپنے نظریہ کو دلائل سے پیش کیا ہے پھر میرے پیش کردہ نظریہ پر کچھ اشکالات پیش کیے ہیں۔

اور دوسرے مستفسر جناب عبدالقادر سومر صاحب (کیمیا ٹی۔ کراچی) ہیں جو ہمارے پرانے کرمفرما ہیں۔ انہوں نے اس نظریہ کی تائید میں مندرجہ ذیل کتابوں میں سے موضوع زیر بحث سے متعلقہ فوٹو سٹیٹ بھیجے ہیں۔ اور ساتھ کچھ رجال کی کتابوں میں سے متعلقہ راویوں پر تنقید کے فوٹو سٹیٹ بھی۔ ان کتابوں اور ان کے مؤلفین کے نام درج ذیل ہیں۔

- ۱۔ ندائے حق از محمد حسین نیلوی۔
- ۲۔ دُعا کرنے کا اسلامی دستور از فضل الرحمن کاشمیری۔
- ۳۔ توحید خالص قسط علیہ قبر یہ آستانے از ڈاکٹر مسعود عثمانی۔
- ۴۔ ہفت روزہ الاسلام کے ایک مضمون ”مسئلہ سماع موتی“ سے چند اقتباسات۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سومر صاحب ایک طرف میرے پیش کردہ نظریہ سے متاثر ہیں۔ دوسری طرف مذکورہ بالا کتب میں پیش کردہ نظریہ سے بھی متاثر ہیں۔ لہذا وہ متذبذب ہیں اور قرآن و حدیث کی روشنی میں راہنمائی چاہتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم مستفسر علیہ کے دلائل، اس کا جواب اور ان دلائل کا جائزہ

پیش کریں گے:

۱۔ قبر کا اصل مقام:

اس دعوائے سے متعلق کہ ”قبر سے مراد زمینی گڑھا یا حتی قبر نہیں، بلکہ بزرگی قبر ہے“

مستفسر علیہ کے دلائل یہ ہیں:

- ۱۔ قرآن میں حضرت نوح کی قوم کے متعلق آیا ہے کہ ”اَعْرَقُوا فَاَدْخَلُوْا نَارًا“ اور فالعقیب کے لیے آتی ہے۔ حالانکہ قوم نوح کو، اور اسی طرح قوم فرعون کو بھی،

قبر نصیب ہی نہ ہوتی تھی۔ اور قرآن نے یہ کلیہ بھی بتلایا ہے کہ "ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ" (۱۱۸:۷)۔
 "اللہ نے انسان کو موت دی پھر اسے قبر میں داخل کیا" یعنی ان غرق ہونے والوں کو
 زمینی قبر تو نصیب ہی نہ ہوتی تھی لیکن عذاب مرنے کے ساتھ ہی شروع ہو گیا۔ پھر مرنے
 کے ساتھ ہی قبر کا ذکر بھی موجود ہے۔ لہذا قبر سے یہ زمینی گڑھا مراد لینا درست نہیں۔
 اور یہ گڑھا تو مجازی قبر ہے جو دنیا میں بہت کم انسانوں کو نصیب ہوتی ہے۔

ب: حدیث میں آیا ہے:
 إِنَّمَا مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى بَيْتِ يَسُودَ بَنِي يَسُوكَ
 عَلَيْهِمْ أَنْفَالٌ اِزْمَازِمٌ كَسَبُوا عَلَيْهَا وَإِنَّهَا لَتُعَذَّبُ فِي قَابِرِهَا"
 (مشکوٰۃ باب البکاء علی المیت)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک یہودیہ پر گزرے جس پر رو یا جابر کا
 تھا تو آپ نے فرمایا، ”یہ لوگ اس پر روتے ہیں جبکہ اسے اس کی قبر میں
 عذاب دیا جا رہا ہے“

اس یہودیہ کے متعلق جس کا جنازہ دیکھ کر ہی آپ نے فرمادیا تھا کہ اسے اس کی
 قبر میں عذاب دیا جا رہا ہے۔ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قبر سے مراد زمینی گڑھا
 نہیں بلکہ برزخی قبر ہے۔ جہاں وہ دفن ہونے سے پہلے ہی عذاب میں مبتلا تھی۔
 ج: جب روزِ قیامت مردے اپنی اپنی قبروں سے جی اٹھیں گے تو اس وقت سے
 پہلے ہی موجودہ زمین و آسمان تو ختم ہو چکے ہوں گے۔ پھر قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا
 کیسے لیا جاسکتا ہے؟

۲۔ کیا عذابِ قبر کا تعلق جسم سے بھی ہے؟

میں نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ عذابِ قبر سے طسی نہ طسی حد تک جسم بھی متاثر ہوتا
 ہے۔ خواہ یہ مقدار کتنی ہی کم یا گاہے گاہے ہو، لیکن ہوتا ضرور ہے اور اس پر دلیل یہ تھی کہ
 جیسے نیند میں بعض اوقات رُوح کو وارداتِ رُوح و راحت سے جسم بھی متاثر ہوتا ہے
 اسی طرح عذابِ قبر سے جسم بھی متاثر ہوتا ہے۔ اس پر آپ نے دو اشکال
 پیش کیے ہیں:

۱) فرعون کا جسم دنیا میں موجود ہے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ تصریح بھی فرمادی کہ

”فَالْيَوْمَ نُخَيِّدُكَ بِبَدَنِكَ“ تو پھر عذاب میں جسم کی شمولیت کیونکر ہوتی؟
(ب) کافر قیامت کے دن نہیں گئے؛

”مَنْ بَعَثْنَا مِنْ مَنَزِقِدْنَا“ (یسن: ۵۷)

”ہمیں ہماری آرام گاہ سے جس نے اٹھا دیا؟“

اب اگر اس زمینی گڑھے کو قبر، اور جسم سے عذاب کا تعلق بھی تسلیم کر لیا جاتے تو یہ قبر عذاب گاہ ہوتی۔ آرام گاہ کیسے ہوتی؟
یہ تو ہیں فاروق صاحب کے دلائل! — اور سو مرد صاحب نے جو کتابوں

سے فریڈ سٹیٹ بھیجے ہیں، ان سے بھی اسی نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ بس انداز بیان الگ الگ ہے۔ میرے خیال میں یہ حضرات دوسری انتہاء کو پہنچ گئے ہیں۔ سہارا موتی کے قائلین اس انتہاء کو پہنچے کہ قبر میں مردہ ہر واقعہ کار کا سلام سنتا اور پھر اس کا جواب دیتا ہے یا یہ کہ ”مَنْ فِي الْقَبْرِ“ سے مراد مردہ دل لوگ ہیں۔ جبکہ ہمارے یہ کرم فرما اس انتہاء کو پہنچے کہ قبر کا معنی ہی بدل دو، پھر سلام کیا، اس کا سننا اور جواب دینا کیسا؟ نہ رہے بانس نہ بچے بانسری۔ تاہم ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ان حضرات نے جو کچھ تاویل و تعبیر کی ہے وہ اس لیے کی ہے کہ شرک کے اس سبک بڑے چور دروازے کی جبروی کٹ جاتے۔ ان کا یہ غلو ص نیت درست اور مبارک، مگر ہمیں افسوس ہے کہ حقائق اس کی تائید نہیں کرتے۔ جھلا سوچتے، اگر قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا نہ ہو بلکہ برزخی مستقر ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بدرگے کھنڈ میں پر جا کر ان مردہ کفار کو مخاطب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ اپنی جگہ پر بیٹھے یا پھر ٹپے ہی یہ خطا فرما دیتے؟ اسی طرح آپ بقیع میں جا کر کھیلوں دعائے مغفرت فرماتے تھے؟ اور آخر قبرستان میں جا کر ہی خوں آپ ”السلام علیکم یا اہل القبور“ بھتتے ہیں؟
اب میں اپنے نظریہ کی تائید میں چند مزید احادیث صحیحہ پیش کر دوں گا:

پہلی حدیث:

”عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَبْرَيْنِ يُعَذَّبَانِ فَقَالَ إِنَّهُمَا يُعَذَّبَانِ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَيْفٍ، أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ لَا يَسْتَبِرُ مِنَ الْبُؤْلِ، وَأَمَّا الْآخَرُ فَكَانَ يَمْتَشِي بِاللَّيْمَةِ - ثُمَّ أَخَذَ

جَرِيدَةً رَطْبَةً فَشَقَّهَا بِنِصْفَيْنِ ثُمَّ عَرَزَ فِي كُلِّ قَبْرٍ وَاحِدَةً
فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ لِمَ صَنَعْتَ هَذَا؟“ فَقَالَ:
”لَعَلَّهُ أَنْ يُخَفَّفَ عَنْهُمَا مَا لَمْ يُيَسِّرْ لَهَا“

(بخاری - کتاب الجنائز - باب الجرید علی القبر)
”ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں پر گزرتے
جنہیں عذاب ہو رہا تھا تو آپ نے فرمایا، ”ان دونوں قبر والوں کو عذاب
دیا جا رہا ہے اور کسی بڑے گناہ کی پاداش میں بھی نہیں۔ ایک تو پیشاب
سے بچاؤ نہیں کرتا تھا اور دوسرا چغلی کھاتا پھرتا تھا، پھر آپ نے محمد
کی ایک ہری ڈالی لی اور اس کو زیچ میں سے چیر کر دو ٹکڑے کیے اور ہر
قبر پر ایک ایک کو گاڑ دیا۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ نے
ایسا کس لیے کیا؟“ آپ نے فرمایا: ”جب تک یہ ڈالیاں نہ سوکھیں
شائد ان کا عذاب ہلکا ہو“

اب دیکھیے اس حدیث سے مندرجہ بالا دونوں اشکالات ختم ہو جاتے ہیں۔

وہ یوں کہ:

۱- لفظ ”مَرَّ بِقَبْرَيْنِ“ اس بات کا متقاضی ہے کہ قبر سے مراد یہی زمینی گڑھے
ہیں نہ کہ برزخ میں رُوح کا استقرار۔

۲- آپ نے اسی قبر پر ہری ڈالی گاڑی جس میں جسم مدفون تھے اور فرمایا کہ شائد اس
سے عذاب ہلکا ہو۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جسم بھی عذاب سے متاثر ہوتا ہے۔

دوسری حدیث:

عَنْ أَبِي أَيُّوبَ قَالَ خَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ
وَجَدَتْ الشَّمْسُ نَسِيعَ صَوْتًا فَقَالَ: ”يَوْمَئِذٍ تَعَذَّبُ فِي
قُبُورِهَا“ (بخاری، کتاب الجنائز، باب لتعود من عذاب القبر)
”ابو ایوب انصاریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مدینہ سے)
باہر نکلے اور اس وقت سورج غروب ہونے کو تھا۔ آپ نے ایک
آواز سنی تو فرمایا، ”یہودیوں کو ان کی قبروں میں عذاب ہو رہا ہے“

اگر قبر سے مراد بزرگی قبر لی جائے تو لفظ "خروج" بے کار ہے۔ مدینہ میں رو کر بھی آپ یہ بات بیان فرما سکتے تھے۔ آخر آپ نے قبروں کے پاس جا کر قبروں کیسے فرمایا؛ تیسری حدیث:

"عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ: أَنَّ أَسْوَدَ رَجُلًا أَوْ امْرَأَةً كَانَ يَقُومُ الْمَسْجِدَ فَمَاتَ وَلَمْ يَعْلَمْ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَوْتِهِ فَذَكَرَهُ ذَاتَ يَوْمٍ فَقَالَ: «مَا نَعَدَ ذَلِكَ إِلَّا نِسَاءً؟» قَالُوا: «مَاتَ يَا رَسُولَ اللَّهِ» قَالَ: «أَفَلَا أَدْنُمُونِي؟» فَقَالُوا: إِنَّكَ كَانَ كَذَا وَكَذَا قِصَّةً قَالَ فَحَقَّرَ رِشَانَهُ - قَالَ: فَذَلُّونِي عَلَى قَبْرِهِ فَأَتَى قَبْرَهُ فَصَلَّى عَلَيْهِ» (بخاری، کتاب الجنائز، باب الصلوة على القبر بعد ما يدفن)

"ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک کالا مرد (یا کالی عورت) مسجد میں بھاڑ دیا کرتا تھا۔ وہ مر گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے مرنے کی خبر نہ ہوئی۔ ایک دن آپ نے اُسے یاد فرمایا اور پوچھا کہ "وہ کدھر ہے اسے کیا ہوا؟" لوگوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! وہ تو مر گیا ہے" آپ نے فرمایا "تو پھر تم نے مجھے کیوں خبر نہ دی؟" لوگوں نے عرض کیا کہ "یوں ہوا اور یوں ہوا" عرض اس کا قصہ بیان کیا اور کہا کہ اسے درخور اعتنائے سمجھتے ہوئے آپ کو اس کی موت کی اطلاع دینا مناسب نہ سمجھا۔ آپ نے فرمایا "مجھے اس کی قبر پر لے چلو" راوی کہتا ہے کہ پھر آپ اس کی قبر پر آئے اور اس پر نماز جنازہ پڑھی۔

یہ حدیث بھی اپنے مضمون میں صاف ہے کہ (۱) قبر سے مراد یہی زمینی گڑھا ہے ورنہ آپ اس کی قبر پر کیوں تشریف لے گئے؟ (۲) یہ کہ قبر پر آ کر دعائے استغفار کرنے یا نماز جنازہ پڑھنے سے یہ بھی ثابت ہو سکتا ہے کہ اس قبر میں جو جسم پڑا ہے اس کا عذاب و ثواب قبر سے تعلق ضرور ہے۔

اور قرآن میں یہ الفاظ وَلَا تَقْفُمْ عَلَى قَبْرِهِ سے مراد زمینی گڑھا، یعنی کی پوری وضاحت ہو رہی ہے مستفسر کے دلائل کا جائزہ | اب ہم فاروق صاحب کے دلائل پر تبصرہ

کرتے ہیں!

۱- یہ مفروضہ کہ ”یہ دنیاوی (حسی) قبر تو تم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے“ درست نہیں۔ جن اقوام پر خدا کا عذاب آیا اور قرآن میں مذکور ہے۔ اگر صرف ان کا تناسب نکالا جائے تو بھی یہ مفروضہ درست ثابت نہیں ہوتا۔ جبکہ بیشمار ایسی اقوام ہیں جن پر عذاب نہیں آیا۔ وہ لوگ اپنی طبعی موت مرتے رہے اور زمین میں دفن ہوتے رہے اور یہ سلسلہ ابتدائے نوح انسان سے جاری ہے۔ یعنی جب قابیل نے ہابیل کو مار ڈالا، جو اس دنیا میں پہلا قتل بھی تھا اور پہلی موت بھی تو اسے اللہ کی طرف سے مردہ کو دفن کرنے کا طریقہ سکھایا گیا اور یہی طریقہ تمام انبیاء سکھاتے رہے۔ لہذا قاعدہ کلیہ کے طور پر یہی بات بھی جاسکتی ہے کہ انسان مرنے کے بعد قبر میں دفن ہوتا ہے۔ اب اگر آل فرعون یا قوم نوح غرق ہو گئے یا اہل سبا پر سیلاب آیا یا دنیا بھر میں سے ایک قوم (ہندو) اپنے مردوں کو دفن کرنے کے بجائے جلادیتی ہے تو یہ سب باتیں مستثنیات میں شمار ہوں گی اور آج اگر کوئی چاہے تو خود یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ قبر میں دفن ہونے والوں کی تعداد ڈوبنے یا جلنے والوں کی تعداد سے بہت زیادہ ہے۔ لہذا عام قاعدہ کے طور پر جو بات بھی جاسکتی ہے وہ یہی ہے کہ

ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ“ باقی سب استثناء کی صورتیں ہیں جیسا کہ عذاب قبر بذات خود ایک استثنائی صورت ہے جس کی تفصیل میں پہلے پیش کر چکا ہوں کہ یہ دور قرآن کی زبان میں موت کا دور ہے نہ کہ زندگی کا۔

۲- آپ نے جو حدیث اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش فرماتی ہے اس کے الفاظ میں: ”مَنْ أَلْتَمَسَ مَوْتَهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَىٰ يَوْمٍ يُؤَدِّيهِ“ یعنی آپ ایک یہودی پر گزرے جس پر لوگ رورہے تھے۔ اس حدیث میں قطعاً یہ وصاحت نہیں کہ آپ اس کے جنازے یا میت پر گزرے یا اس کی قبر پر؛ اغلب کمان یہی ہے کہ آپ اس کی قبر سے گزرے تھے جیسا کہ اس مشکوٰۃ کے ترجمہ سے بھی ظاہر ہے۔ ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں:

”گزرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزدیک قبر ایک عورت یہودیہ کے کہ روایا جاتا تھا اس پر“ مشکوٰۃ ، باب البكاء علی المیت مطبوعہ مکتبہ اثریہ

سانگہ بل ص ۱۸۲)

۳- تیسری دلیل یہ تھی کہ جب زمین ہی بدل جائے گی تو یہ زمینی گودھا کہاں رہے گا؟ سو گزارش ہے کہ زمین بدل ضرور جائے گی لیکن نیست و نابود یا فنا نہیں ہو جائے گی۔ قرآن مجید کے الفاظ ”يَوْمَ تَبْدَلُ الْأَرْضُ عِلْمًا لِّرَبِّهِ“ بہر حال اس وقت بھی کوئی نہ کوئی زمین ضرور ہوگی جو اگرچہ یہ موجودہ زمین نہ ہوگی تاہم اسی زمین کی بدلی ہوئی شکل ہوگی۔

۴- جسم کے عذاب سے بے تعلق ہونے کی دلیل جو لفظ مرقد (خواب گاہ یا آرام گاہ) سے لی گئی ہے۔ یہ بھی وضاحت کے لحاظ سے سود مند نہیں۔ ان کفار کا یہ قول تو صرف انسانی فطرت کا مظہر ہے۔ جب کوئی شخص کسی مصیبت میں گرفتار ہو۔ پھر اس سے بڑی مصیبت یا آفت اس پر آن پڑے تو اسے یہ چھوٹی مصیبت کا زمانہ آرام کا زمانہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ لہذا جب کافر ”اشد العذاب“ کو دیکھیں گے تو انہیں یہ تم عذاب والی جگہ اس کے مقابلہ میں مرقد ہی معلوم ہوگی۔ اب خواہ یہ عذاب حسی یا مادی قبر میں ہو رہا ہو یا برزخی قبر میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۵- رہا یہ سوال کہ فرعون کو مرنے کے وقت سے لے کر عذاب ہو رہا ہے مگر اس کا جسم بمصدق ارشاد باری تعالیٰ عذاب کے اثرات سے محفوظ و مامون ہے۔ تو یہ محض ایک استثنائی صورت ہے، جس کی دوسری کوئی مثال نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ، کسی بھی انسان کا جسم خواہ وہ نیک ہو یا بد عذاب و ثواب قبر سے کلمۃ اور کبھی بھی متاثر نہیں ہوتا، درست نہ ہوگا۔ اور درج شدہ احادیث ہمارے اس خیال کی تائید میں پوری رہنمائی کرتی ہیں۔

۳- روحوں کی ملاقات،

اس سوال میں آپ نے کئی اشکالات کا اظہار فرمایا ہے، مثلاً،
 (۱) خواب میں جب روح کلمن سے علیحدگی ہو گئی تو اسی الفکاک روح ہی کا نام تو موت ہے۔ پھر اگر جسم کو بھی عذاب و ثواب میں شریک سمجھ لیا جائے تو یہ زندگی ہوئی موت تو نہ ہوئی؟

(۲) خواب میں کسی شخص کی روح جب کسی مرے ہوئے ظالم انسان کی روح سے،

جو سچین میں مقید ہے، ملتی ہے تو کیا اس سونے والے شخص کی رُوح وہاں پہنچ جاتی ہے یا اس ظالم اور ڈاکو انسان کی رُوح وہاں سے آزاد ہو کر اسے خواب میں آکر ڈراتی دھمکاتی ہے؟ وہ ضابطہ الہی کو توڑ کر اس دنیا میں کیسے آجاتی ہے؟

۳۔ ایک ہی خواب میں ایک رُوح کئی آدمیوں کو خواب میں ملتی ہے تو کیا ایک ہی رُوح سب کو ملتی ہے یا علیحدہ کوئی رُوح؟

ان سوالوں کا جواب دینے کی بجائے میں فاروق صاحب کو یہ مشورہ دوں گا کہ میرے مضمون کا متعلقہ حصہ دوبارہ غور سے پڑھ لیں، خصوصاً ص ۲۴ کا یہ پیرا کہ:

”یہ ایسے بدیہی مشاہدات ہیں جن سے ہر شخص کو سابقہ پڑتا ہے۔ اب اگر انسان ان تجربات و مشاہدات کی وجہ یا اسباب و علل تلاش کرنا شروع کر دے تو وہ اس میں ناکام ہی رہے گا۔ یہی ڈھ حقیقت ہے جس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے یوں فرمائی کہ: ”وَمَا أَدْرِيئْتُمْ فِيمَنْ

الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا“

لہذا میرا غلصہ مشورہ یہی ہے کہ آپ ایسی باتوں کے پیچھے کیوں پڑ رہے ہیں جن کا سمجھنا انسان کی عقل سے ماوراء ہے۔ نہ ہم ان باتوں کے سمجھنے کے مکلف ہیں اور نہ ایسی باتیں اعتقادات میں کوئی مقام رکھتی ہیں۔

۴۔ جدت اور قبر،

جدت اور قبر کا فرق میں نے یہ بیان کیا تھا کہ قبر وہ ہے جس کے نشانات موجود ہوں اور جدت وہ ہے جس کا سرے سے کوئی نشان ہی نہ تھا یا نہ ہو۔ اس پر آپ نے یہ اعتراض اٹھایا ہے کہ قیامت کے دن مردوں کے قبروں سے جی اٹھنے کے متعلق قرآن نے جیسے جدت کا لفظ استعمال فرمایا ویسے ہی قبر کا بھی فرمایا ہے۔ حالانکہ اس وقت یہ زمین ہی بدل چکی ہوگی تو پھر ان میں فرق کیا ہوا؟

چنانچہ جہاں میں نے یہ فرق بتلایا تھا، وہاں یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ یہ میرا اپنا فہم ہے اور مجھے اپنے فہم کو دوسروں سے تسلیم کروانے پر قطعاً کوئی اصرار نہیں۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس پر اہل لغت کا اتفاق بھی ہے کہ دو مترادف الفاظ میں کچھ نہ کچھ ذیلی فرق ہوتا ضرور ہے۔ ورنہ ایک کے بعد دوسرے لفظ کے وجود میں آنے کی کوئی

وجہ نہیں۔ اب میرے اس فہم کی مزید وضاحت یوں سمجھئے کہ قبر کا لفظ عام ہے اور جہت خاص ہے۔ ہر جہت قبر ضرور ہوتی ہے مگر ہر قبر جہت نہیں ہوتی۔ امید ہے اب آپ یہ فرق اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔

۵۔ سماع موتی؛

اس مسئلہ میں فاروق صاحب کا رویہ شدید اور انتہا پسندانہ ہے۔ آپ پوچھتے ہیں کہ جب قرآن کی رُو سے سماع موتی ثابت نہیں ہوتا تو پھر سماع موتی کا قائل مومن ہے یا کافر؟ نیز یہ کہ قلیب بدر کے واقعہ کے فہم میں جب حضرت عائشہؓ کا مقام بلند تر ہے تو پھر جو شخص بلند تر سے کم تر کی طرف رجوع کرے اس کے متعلق آپ کا فتویٰ کیا ہے؟

اس سلسلہ میں میں کوئی فتوے دینے کے حق میں نہیں، البتہ یہ مشورہ دے سکتا ہوں کہ آپ اتنے تشدد نہ ہوں۔ رہا یہ سوال کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اگر سماع موتی کے قائل تھے تو اس کا حوالہ کیا ہے؟ سو اس کے حوالہ کے لیے دیکھیے ”جمع العوائد“ ج ۲، ص ۶۷۹ طبع ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹۶۱ء مطبوعہ مدینہ منورہ۔ الفاظ یہ ہیں:

”رَأَيْتُ ابْنَ عُمَرَ لَيْعُفَ عَلَى قَبْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
فَصَلَّى عَلَيَّ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبِي بَكْرٍ وَعُمَرُ رَوَاهُ
مَالِكٌ“

نیز حواہ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح ج ۲ ص ۵۰۵، الفاظ یہ ہیں:

”قَالَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ: ”مَا نَعَلَمُ أَحَدًا عَنِ أَصْحَابِ النَّبِيِّ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَعَدَّ ذَلِكَ إِلَّا ابْنَ عُمَرَ“ (رواه عبد الرزاق)

یعنی تمام صحابہؓ میں سے صرف عبد اللہ بن عمرؓ ہی رسول اللہ کی قبر پر
دُور دُور پڑھتے تھے۔ دوسرا کوئی صحابی یہ کام نہ کرتا تھا۔

دوسرے مستفسر جناب سومر و صاحب نے مندرجہ ذیل تین امور کی طرف

توجہ دلائی ہے:

۱۔ قبر کا معنی اور مقام؟

اس سلسلہ میں پہلے ہی اپنا نقطہ نظر پیش کر چکا ہوں اور دلائل کا جائزہ بھی ان کے

اس سوال کے لیے بھی وہی جواب کافی ہوگا۔ ان شاء اللہ۔

۲۔ نقد احادیث:

اس سلسلہ میں آپ نے دو احادیث پر تبصرہ فرمایا ہے:

(۱) سیاح فرشتوں والی حدیث (جو نسائی میں مذکور ہے) کے متعلق آپ نے لکھا ہے کہ اس میں ایک راوی "نراذان" ہے جو مجروح ہے اور شیعہ بھی ہے، لہذا یہ حدیث موضوع ہے۔

(۲) "رَدَّ اللهُ عَلَيَّ رُكُوعِي" (ابوداؤد بیہقی) کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں دوراوی ابو صخر حمید بن زیاد اور یزید بن عبد اللہ بن قسیط مجروح ہیں، لہذا یہ حدیث بھی مجروح یا موضوع ہوئی۔

پھر انہی باتوں کی تحقیق کے لیے آپ نے مختلف محتب رجال سے فوٹو سٹیٹ بھی بھیجے ہیں اور مذکورہ بالا کتابوں کے فوٹو سٹیٹ بھی۔ تاکہ ان مصنفین کے تبصرہ کا بھی علم ہو سکے۔

حدیث پر تنقید کرنا ایک مستقل فن ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ ناقد تمام رواہ کے حالات زندگی اور ان کے باہمی روابط سے واقف ہونے کے علاوہ اصول حدیث سے بھی پوری واقفیت رکھتا ہو اور یہ کام ہر کس و نا کس کے بس کا روگ نہیں۔ یہاں کی کتابوں کے تبصرہ پر انحصار کر کے کسی حدیث پر تنقید کر دینا بھی غیر محتاط روش ہے نیز کہ بسا اوقات کسی ایک راوی سے متعلق تبصروں میں اختلاف ہوتا ہے، جیسا کہ خود جناب محمد حسین صاحب نیلوی نے اپنی کتاب "ندائے حق" کے ص ۱۹۵ پر خود اس بات کا اعتراف کیا ہے، وہ ابو صخر بن زیاد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اسے واقعی کئی اصحاب جرح و تعدیل نے ثقہ لکھا ہے مگر بعض دوسرے محققین نے اس کی تضعیف بھی کی ہے۔"

اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ بعض دفعہ ایک محدث کسی راوی کو ضعیف قرار دینے کے باوجود اس سے حدیث روایت کر جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہی حدیث بعض دوسرے طریقوں سے مذکور ہوتی ہے جس کے تمام تر رواہ ثقہ ہوتے ہیں۔ لہذا اندرین صورت حال محدث اس ضعیف راوی کی روایت

کو بھی قبول کر لیتا ہے۔ اسی بنا پر نیلوی صاحب کو اپنی کتاب "نوائے حق" کے ص ۱۹۵ پر یہ فقرہ بھی لکھا پڑا کہ کسی راوی کے متعلق "صرف اتنا کہہ دینا کہ صحیح مسلم کا راوی ہے لہذا قوی ہے یعنی برہم ہے" (یہ فقرہ یزید بن عبد اللہ بن قیسط پر تبصرہ کے ضمن میں آپ نے لکھا ہے) پھر اس صورت حال میں کسی مسئلہ کے مخالف و موافق دونوں، بھینچ تان کر کے اپنا اپنا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لہذا مسلک اعتدال یہی ہے کہ انسان غیر جانبدار ہو کر ان کتب کی طرف رجوع کرے اور اس سے زیادہ محتاط مسلک یہ ہے کہ کسی محدث کے تبصرہ پر قناعت کرے۔

لہذا ہم ان دونوں امدیث کو موضوع بحث کے حق میں نہیں۔ زیادہ سے زیادہ انہیں ضعیف روایات ہی قرار دیا جاسکتا ہے اور ضعیف روایت تائید کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔ البتہ جب ایسی حدیث اپنے مضمون میں منفر دہ ہو تو اس سے احتجاج درست نہیں؛ بالخصوص اعتقادات میں!

اور یہ تبصرہ بھی ہم نے ان مصنفین حضرات کی تحقیق کو ملحوظ رکھ کر پیش کیا ہے ورنہ بہت سے محدثین سیاح فرشتوں والی حدیث کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو جمع الفوائد ج ۲ ص ۶۷۹ حدیث ۹۵۷۵ (مطبوعہ مدنیہ منورہ کعب ۱۳۸۱ھ) الفاظ یہ ہیں:

(۱) "رَوَاهُ أَيْضًا أَحْمَدُ وَابْنُ جَبَّانٍ وَانْحَاكُمُ وَصَحَّحَهُ،
وَأَقْرَبُهُ الدَّهْلِيُّ وَقَالَ الْمُنْبِيُّ رَجَالَ رَجَالٍ الطَّبَّحِ وَ
قَالَ الْعِرَاقِيُّ الْحَدِيثُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ دُونَ قَوْلِهِ سَيِّئًا جِدًّا
كَذَا فِي الْغَيْضِ"

اس حدیث کو احمد، ابن جبان اور حاکم نے روایت کیا اور اسے صحیح کہا، اور ذہبی نے اس روایت کو پائیدار سمجھا اور بیہمی نے کہا کہ اس کے تمام راوی صحیح ہیں اور عراقی نے کہا کہ یہ روایت "سیئہ" کے لفظ کے علاوہ متفق علیہ ہے۔ ایسا ہی فیض القدر شرح جامع المغیر میں بھی لکھا ہے!

(۲) "رَوَاهُ اللَّهُ عَلَى رُوْحِي" والی روایت کو سیوطی نے ضعیف قرار دیا ہے۔

(جامع الصغیر ج ۲ ص ۱۲۸) تاہم موجودہ دور کے محدث البانی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ گو یہ حدیث صحیح کے درجہ کو نہیں پہنچتی۔ تاہم حسن ہے، ضعیف نہیں۔ ان تبصروں کے بعد اس تیسرے طبقہ کے حضرات کے تبصروں کو سامنے لائے، تو خود بخود یہ معلوم ہو جائے گا کہ پہلے انہوں نے ایک نظریہ قائم کیا کہ قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا نہیں۔ پھر ایسی احادیث کو مجروح یا موضوع ثابت کرنے کے لیے اقتدال کی راہ سے ہٹ کر کھینچنا ان سے کام لیا ہے۔ حقیقت وہی ہے جو میں پہلے پیش کر چکا ہوں کہ:

”قرآن سابع موتی کی پر زور تردید کرتا ہے، احادیث صحیحہ استثنائی صورت پیش کرتی ہیں۔ ضعیف اور وضعی روایات اس کا جواز ثابت کرتی ہیں۔ اور بزرگوں کے اقوال اور فرامین قرآن کا رد پیش کرتے ہیں۔“

۳۔ تاویل حدیث:

سومر و صاحب لکھتے ہیں کہ،
 ”احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ ”مردہ کو جب کندھوں پر اٹھایا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ مجھے جلدی لے چلو۔۔۔۔۔“ اس حدیث سے بھی تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ بعض دفعہ حدیث کا بعینہ وہی مطلب نہیں ہوتا جو اس کے ظاہری الفاظ سے ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اس اشکال والی حدیث کا، کسی دوسری اشکال والی حدیث کو ملحوظ رکھ کر مطلب سمجھا جاتے گا۔“

پھر مثال کے طور پر جو دوسری اشکال والی حدیث آپ نے درج فرمائی وہ

یہ ہے کہ:

”بندہ جب نوافل کے ذریعہ میرا تقرب حاصل کر لیتا ہے تو میں بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تا آنکہ میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ پلتا ہے۔“

یہ حدیث درج کرنے کے بعد سومر و صاحب لکھتے ہیں کہ ”اگر کوئی وحد الوجودی یا حلولی یہ کہہ دے کہ خدا تو خود جلتا ہے کہ میں اس کے اعضاء بن جاتا ہوں تو حیرت اس سے یہ نہ کہا جائے گا کہ اس کے یہ معنی نہیں، یہ تو انداز بیان ہے؛“

غور فرمائیے کہ اگر کسی ایسے صوفی کو یہ کہا جائے کہ یہ تو محض انداز بیان ہے تو کیا وہ آپ کے اس جواب سے مطمئن ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں، صرف انداز بیان کہنے سے وہ کبھی مطمئن نہیں ہوگا، بلکہ اس کے اطمینان کے لیے اسے حدیث کا مطلب سمجھانا پڑے گا اور اسی حدیث کے مطلب میں نظریہ حلول کا پورا رد موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ حلولی یا وحدت الوجودی جبار و معبود ہونے کا قائل نہیں ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو خدا کا ایک حصہ اور اس کا ہمسر تصور کرتا ہے جبکہ یہ حدیث شروع ہی یہاں سے ہوتی ہے کہ ”جب میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرا تقرب حاصل کر لیتا ہے۔“ گویا جبار و معبود کا تصور ہی اس حدیث کی بنیاد ہے۔ رہا اس کے اعضاء کا اللہ کے اعضاء بن جانے کا مسئلہ، تو اس کو جب پہلے حصہ سے متعلق کیا جائیگا، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس بندہ کے اعضاء سے منشاء الہی کے خلاف کوئی کام صادر ہی نہیں ہو سکتا۔ یعنی جو کچھ خدا چاہتا ہے وہی کچھ اس کے اعضاء کرنے لگتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اس بندے کے اعضاء پر منشاء و منشاء الہی اتنی محیط ہو جاتی ہے کہ منشاء الہی کی تنفیذ کے لیے اس کے اعضاء آلہ کار کا کام دینے لگتے ہیں اور یہی عبودیت کا بلند مقام ہے جو حلولی اور وحدت الوجودی نظریہ کی عین ضد ہے۔ حلولی نظریہ میں عبادت محضی اور تقرب الی اللہ کیسیا؟ پھر اس حدیث کے لگے الفاظ یوں ہیں:

”وَرَأَى سَأَلَنِي لَا مَعْطِيكَ وَلَا كَيْفَ اسْتَعَاذَنِي لَا عَيْدَانَهُ“

(بخاری کتاب الترقاق)

”اور اگر وہ (میرا مترتب بندہ) مجھ سے کوئی چیز مانگتا ہے تو میں اسے

دیتا ہوں اور اگر مجھ سے پناہ مانگے تو میں پناہ دیتا ہوں“

گویا اس حدیث کا پہلا حصہ بھی جبار و معبود کے تعلق کو واضح کر رہا ہے اور آخری حصہ بھی اسی بات کی تائید کر رہا ہے تو پھر ہمیں اس حلولی کو محض انداز بیان کہہ کر مطمئن کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہمیں تو اس حدیث سے اس کا پورا پورا رد کرنا

چاہیے اور یہ بھی بتلادینا چاہیے کہ اس سیاق و سباق کے درمیان والی عبارت کا صرف یہی مطلب ہو سکتا ہے نہ وہ جو تم سمجھ رہے ہو۔ جیسی یہ محض انداز بیان نہیں! اس حدیث کے درج کرنے سے غالباً آپ یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ جیسے اس اعضاء والی حدیث کے ظاہری الفاظ اور ہیں اور مطلب اور ہے، اسی طرح اس مردے کے کلام کرنے والی حدیث کے ظاہری الفاظ اور ہیں اور مطلب اور ہے۔ اور وہ مطلب یہ ہے کہ ہم نہ تو مردہ کے ہونٹ ہلکتے دیکھتے ہیں، نہ ہی اس کی آواز سنتے ہیں۔ مگر ظاہری الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مردہ بولتا ہے۔ اسی طرح عذاب قبر کے سلسلہ میں جو قبر کا ظاہری لفظ ہے۔ اس سے مراد زمینی گڑھا لینا ضروری نہیں۔ اس کا مطلب کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔

ہم اسے خیال میں ہمیں اس مردہ کے بولنے والی حدیث میں بھی کسی قسم کی تاویل کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ ہم اس کا کلام سن یا سمجھ نہیں سکتے۔ ارشاد باری تعالیٰ:

”وَلَا يَمُنُّ شَيْءٌ إِلَّا بِسَمْعٍ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَنْفَعُونَ تَسْبِيحَ حَرَمٍ“ (اسی آیت پر)

”کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح کے ساتھ حمد بیان کرتی ہو مگر تم ان کی تسبیح کر سکتے نہیں“

تو جب ہم اتنی مختصر التعداد اشیاء کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے، اور ہم اسے اس نہ سمجھنے کی وجہ سے نہ تو ان کی تسبیح میں کوئی فرق آتا ہے نہ ہمیں اس کی تاویل کی ضرورت پیش آتی ہے تو پھر اگر ہم ایک مردے کی بات سن یا سمجھ نہ سکیں تو آخر اس سفر کی صورت اختیار کرتے ہوئے تاویل کی راہ کیوں سوچیں؟ اور قبر کا معاملہ تو اس سے بھی خاص ہے۔

قبر ایک مادی اور حسی چیز ہے۔ قبر کا لفظ بولنے سے فوراً ہر کوئی سمجھ جاتا ہے، اور ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے، تو پھر آخر اس قبر کو زمینی قبر ہی سمجھ لینے سے کیلچہ راجح؟

ماہل استفسارین کے سوالات و اشکالات کا جواب دینے کے بعد مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنے نظریہ کی ایک بار پھر وضاحت کر دوں جو اس طرح ہے:

- ۱- قبر سے مراد زمینی گڑھا ہے جس میں مردہ کو دفن کیا جاتا ہے۔ یہی کچھ رسول اللہ اور صحابہ نے سمجھا تھا۔
- ۲- قبر کی نئی تعبیر کہ اس سے مراد زمینی گڑھا نہیں بلکہ برنجی قبر ہے، مابعد کی پیداوار ہے جو قریط یا دوسری انتہا ہے اور یہ غالباً شرک کے اس چودہ دروازہ کو بند کرنے کے لیے اختیار کی گئی ہے۔
- ۳- مرنے کے بعد روح کو نیا جسم مخطا نہیں ہوتا بلکہ روح کا اپنا بھی جسم اور شکل ہوتی ہے اور یہ اس دنیوی زندگی میں بھی ہے۔ خواب میں ہی شکل و صورت ہوتی ہے اور یہ شکل و صورت

مرحلہ میں بھی تھی۔ اور اس کی شکل و صورت انسان کے ظاہری جسم کی شکل و صورت جیسی ہی ہوتی ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے زیتون کے درخت میں زیتون کا تیل یا گولہ میں جلنے والی گیس یا آگ۔

۴۔ مرنے کے فوراً بعد ہی رُوح کو عذاب و ثواب سے دوچار ہونا پڑتا ہے خواہ ابھی مُردہ دفن نہ ہوا ہو اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

۵۔ مرنے کے ساتھ ہی فرشتے مُردہ کی رُوح کو آسمانوں کی طرف لے جاتے ہیں، پھر اس وقت فرانس لاتے ہیں جب مُردہ قبر میں دفن ہو چکتا ہے۔ اس وقت اس سے سوال و جواب ہوتے ہیں اور وہ جانے والے آدمیوں کے جوتوں کی چاب بھی سنتا ہے اور یہ سب اضطراری امور ہیں۔ ان میں استفتا یہ ہے کہ جن لوگوں کو قرصیب ہی نہ ہوان پر یہ واردات صرف روح پر ہی واقع ہوتے ہیں۔

۶۔ کبھی کبھار اس رُوح کے عذاب و ثواب کا خلیفہ سا اثر اس جسم تک بھی پہنچ جاتا ہے جو قبر میں دفن ہوتا ہے (اگر ہو تو) جیسا کہ خواب میں انسان کی رُوح تو رنج و راحت سے متاثر ہوتی ہی ہے، لیکن کبھی کبھار اس کا اثر انسان کے بستر پر پڑے ہوئے اور سوتے ہوئے جسم تک بھی پہنچ جاتا ہے۔

۷۔ جس طرح سونے والے شخص کے خواب میں دنیا اور جہان اس موجودہ دنیا جہان سے الگ ہوتے ہیں اور وہ جاننے والوں کے اعمال و حرکات اور آواز سے قطعاً بے خبر ہوتا ہے اسی طرح مرنے ہوئے انسان کی بھی دنیا جہان، اس موجودہ دنیا جہان سے الگ ہوتی ہے اور وہ ان کے اعمال و حرکات اور آواز سے قطعاً بے خبر ہوتا ہے لہذا قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ مُردے جو قبروں میں مدفون ہیں اور اسی طرح ان کی روحیں بھی، ہم دنیا والوں کی آواز یا فریاد قطعاً سُن نہیں سکتے اور اس میں استثناء یہ ہے کہ اگر اللہ چاہے تو کسی کو سنا بھی سکتا ہے۔

۸۔ ایسے سوالات یا اشکالات، کہ خواب میں ایک انسان کی رُوح کسی مرنے ہوئے کی رُوح یا زندہ کی رُوح سے کیسے ملتی ہے؟ ان کا حل تلاش کرنا انسانی عقل سے ماوراء ہے۔ ان کے پیچھے پڑنے کا کوئی فائدہ نہیں، نہ ہی ایسی باتوں کا عقائد سے کچھ تعلق ہے۔

۹۔ رسول اللہ پر جہاں ہمیں سے بھی درود پڑھا جائے، وہ فرشتوں کے ذریعہ ان تک پہنچا دیا جاتا ہے۔

۱۰۔ عالم بندخ فی الحقیقت موت کا عالم ہے کیونکہ اس میں رُوح اور جسم کا انحصال ہوتا ہے لیکن اس میں بھی استثنائی صورت موجود ہے تاہم اس میں موت کے اثرات ہی غالب رہتے ہیں۔ جس طرح اس دنیا میں، جو کہ عالم حیات ہے، استثنائی صورت خواب ہے اور اس خواب میں حیات کے اثرات غالب ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم علماً اتم و سکرہ احکم



ڈاکٹر عثمانی صاحب کے دلائل کا جائزہ

مسائل

(۲)

متعلقہ

روح، مقامِ قبر اور سماعِ موتی

(یہ جوابات محدث کی دوا قساط ربیع الاول اور ربیع الآخر ۱۴۰۵ھ میں شائع ہوئے)
محدّث جون ۱۹۸۴ء میں "مسائل" کے عنوان سے میرا جو مضمون شائع ہوا تھا، اس سے متعلق دو حضرات کی طرف سے خطوط موصول ہوئے۔ ان میں ایک تو وہی پرانے گورنر صاحب سومرو صاحب ہیں اور دوسرے اشفاق صاحب ناظم آباد کراچی سے تعلق رکھتے ہیں۔

جناب سومرو صاحب نے کیپٹن مسعود الدین عثمانی صاحب کا پورا لٹریچر بھی مجھے مطالعہ کے لیے بھیج دیا ہے اور استدعا کی ہے کہ میں اس کے مطالعہ کے بعد اپنی رائے سے آگاہ کر دوں۔ عثمانی صاحب کا لٹریچر تو میں پہلے ہی سرسری نظر سے دیکھ چکا تھا۔ اب نظر ثانی کا موقع مل گیا۔ جبکہ اشفاق صاحب کا خط خاصا طویل ہے۔ اسے خط کے بجائے عتاب نامہ کہنا ہی زیادہ مناسب ہو گا۔ یہ حضرت عثمانی صاحب کے نہایت شدید اتنی اور ان کے مخصوص نظریات میں عثمانی صاحب سے بھی زیادہ سخت معلوم ہوتے ہیں۔ خط کا لب و لہجہ نہایت تند و تیز ہے۔ ہر وہ محدّث، امام یا عالم حدیث جو انہیں اپنے مخصوص نظریات کے خلاف نظر آیا، کھلے دل سے اور تحقوک کے حساب سے انہیں بد عقیدہ، گمراہ اور کافر و مشرک قرار دے دیا ہے۔

علمی مسائل کی تحقیق میں یہ انداز قطعاً غیر مناسب ہے۔ کسی مسئلہ میں اختلاف

ہو جانا ایک فطری امر ہے، لیکن جب اس میں اس قسم کا تشدد و تعصب پیدا ہو جائے تو یہ چیز امت میں اختلاف اور تفرقہ بازی کی بنیاد بن جاتی ہے، جسے قرآن نے شرک کے مترادف قرار دیا ہے۔ اشفاق صاحب کو اس بات کا ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ جس جرم کی پاداش میں وہ دوسروں کو کافر و مشرک قرار دے رہے ہیں، خود نہیں اس سے بڑے جرم کا ارتکاب تو نہیں کر رہے ہیں؛ بالخصوص اس صورت میں جبکہ رسول اللہ کا یہ واضح ارشاد موجود ہے کہ اگر کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو کافر مانتا ہے، تو اگر وہ کافر نہیں تو گھٹنے والا ضرور کافر ہو جاتا ہے۔ لہذا تکفیر بازی سے سختی الوسع پر مہیز لازم ہے۔

اب قرآن کا انداز بیان ملاحظہ فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں اور عیسائیوں کا مھلا ہوا شرک — حضرت عزیر کو ابن اللہ کہنا اور عیسائیوں کا تین خداؤں کا عقیدہ رکھنا — بیان کرنے کے باوجود انہیں مشرک نہیں کہا بلکہ اکثر مقامات پر اہل کتاب ہی کہا ہے۔ لہذا میں اشفاق صاحب کی بجائے عثمانی صاحب سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنے بقیعین کو ہدایت کریں کہ علمی مسائل کی تحقیق میں فرو تر باتوں پر اتر آنے کے بجائے علمی انداز ہی اختیار کیا کریں۔

اشفاق صاحب کے اس طویل خط میں تمام کے تمام اقتباسات عثمانی صاحب کے لٹریچر ہی سے دیے گئے ہیں۔ لہذا ہم اس خط کو بعینہ چھاپ دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ اس سے جہاں ایک طرف قارئین کو عثمانی صاحب کے لٹریچر کا غلامہ معلوم ہو جائے گا۔ وہاں یہ بھی معلوم ہو گا کہ یہ حضرات ان نظریات کے مخالفین کے لیے عیسوی زبان استعمال کرتے ہیں۔ یہ خط بجنسہ درج ذیل ہے:

اشفاق صاحب کا عتاب نامہ:

مکرمی و محترمی مولانا عبد الرحمن بھیلانی صاحب السلام علیکم۔

محدث جون ۱۹۸۴ء کے شمارے میں مراسلات کے عنوان سے آپ نے رُوح، عذابِ قبر اور سماعِ موتی سے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، اس میں چند باتیں میرے فہم سے بالاتر ہیں۔ امید ہے کہ آپ اگلی اشاعت میں میرے ان اشکالات کا واضح جواب شائع فرمائیں گے۔ مشکور ہوں گا۔

علی دوسرے گمراہ لوگوں کی طرح آپ نے بھی قبر سے مراد ہی گڑھا لیا ہے جو صحیح

نہیں۔ دراصل ہر مرنے والے کو قرآن کے فرمان کے مطابق (تَشْرَأَمَاتٌ فَأَقْبَرُہُ) قبر ملتی ہے۔ چاہے اس کو مچھلیاں ہی ہرپ کر گئی ہوں۔ یہی اصل قبر ہے جہاں روح کو دوسرے برزخی جسم میں ڈال کر قیامت تک رکھا جائے گا۔ اور اس پر راحت یا عذاب کا پورا زمانہ گزرے گا۔

بخاری جلد ۲ ص ۶۶۵ میں یہ روایت موجود ہے کہ نبیؐ نے فرمایا کہ میں نے عمر و ابن العاصؓ کو دیکھا کہ وہ اپنی آنٹوں کو بھینچ رہا تھا۔ اسی طرح بخاری ج ۱ ص ۱۸۵ میں سمرہ بن جندبؓ کی طویل روایت موجود ہے، جس سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ رُوحوں کو جسم برزخی ملتا ہے اور رُوح اور اس برزخی جسم کے مجموعے پر راحت و عذاب ہوتا رہے گا۔ یہ عذاب کا سلسلہ تا قیامت چلے گا۔ یہ برزخی جسم ایسا ہے کہ اگر اس کو نقصان پہنچایا جائے تو یہ پھر بن جاتا ہے۔ دنیا میں زنا کاروں کی قبریاں مختلف ملکوں میں ہوتی ہیں مگر برزخ میں ان کو ایک ہی نور میں برہنہ حالت میں جمع کر کے آگ کا عذاب دیا جاتا ہے، اسی طرح بخاری جلد ۱ ص ۸۴ پر برابر بن عازبؓ سے روایت موجود ہے کہ جب ابراہیمؑ کی وفات ہوئی تو رسولؐ نے فرمایا، کہ ان کے لیے جنت میں ایک دودھ پلانے والی ہے۔ اسی طرح شہدار کے لیے مکہ جلد ۲ ص ۱۳۵ میں روایت عبد اللہ بن مسعودؓ سے آئی ہے کہ رسولؐ نے ارشاد فرمایا کہ شہدار کی رُوحیں سبز اڑنے والے قالبوں میں ہیں۔ اور ان کے لیے قندیلیں عرش الہی سے لٹکی ہوتی ہیں۔ ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شہدار، عام مومن، کافر، مشرک سب ہی کو ایک برزخی جسم ملا ہے اور وہی اُس کے لیے برزخی قبر ہے عذاب اور ثواب کا سارا معاملہ اسی برزخی جسم کے ساتھ ہوتا ہے نہ کہ گڑھا جس کو غلطی سے آپ نے بھی قبر کا نام دے دیا ہے اور نہ اس عنصری جسم کو عذاب اور ثواب سے کوئی تعلق۔

آپ نے اس گڑھے کو قبر ثابت کرنے کے لیے جو چند احادیث تحریر فرمائی ہیں ان کا جواب یہ ہے :
قبروں پر ٹھنڈیاں لگانے سے متعلق بخاری کی جو روایت نقل فرمائی ہے اس کا منہم یہ ہے کہ جس طرح ایک لیکچر دینے والا اپنی زبان سے ایک مسئلہ بیان کرتا ہے اور

تختہ سیاہ پر اس کو لکھتا بھی جاتا ہے تاکہ کان سن کر اور آنکھیں دیکھ کر خوب یاد رکھیں۔ اسی لیے آپ نے شاخیں لگا کر برزخی عذاب سمجھا دیا۔ رہا یہ سوال کہ یہ شاخیں دنیاوی قبروں پر کیوں لگائیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ برزخ میں صحابہ کرامؓ کو لے جا کر ان کی اصلی قبروں پر لگانا ناممکن تھا۔ دراصل یہ بتانا تھا کہ ان قبروں میں جو مُردے دفن کیے گئے تھے ان پر برزخ میں یہ حالات گزر رہے ہیں۔ یہ نبیؐ کا معجزہ تھا۔ اس حدیث کی آپ نے سن مافی التشریح کر کے یہ بات نکال لی کہ انہی دنیاوی قبروں میں دنیاوی جسموں پر عذاب ہو رہا تھا۔ یہ بڑی گستاخی ہے اور نبیؐ پر کتاب اللہ کے جھٹلانے کا غلط الزام ہے۔

نبیؐ کو کتاب اللہ کی تشریح اور تائید کے لیے بھیجا گیا تھا جھٹلانے کے لیے تو نہیں۔

اسی طرح بعض لوگ مسلم کی ایک روایت پیش کرتے ہیں جس میں قبروں کے پاس سے گزرتے ہوئے نبیؐ کا خچر بدکا۔ اور اس سے یہ دلیل نکالی جاتی ہے کہ قبروں پر ان ہی دنیاوی قبروں میں عذاب ہو رہا ہے جس کی صحیح و پکار کو سن کر خچر بدکا۔ خدا سوچے، کتنے خچر، گھوڑے، گدھے آج بھی قبرستانوں میں ٹھومتے رہتے ہیں، ایک بھی نہیں بدکا۔ دراصل یہ نبیؐ کا معجزہ تھا۔ اور اس خاص واقعہ کے ذریعے نبیؐ نے کفار پر برزخی عذاب، جو ان کو برزخی قبر اور برزخی جسم میں دیا جا رہا تھا، صحابہ کرامؓ کے ذہنوں میں محفوظ فرما دیا۔ مسلم کی ایک روایت جو جلد ۱ ص ۳۹ پر موجود ہے جس میں نبیؐ نے قبر پر نماز ادا فرمائی۔ بخاری کے حوالے سے آپ نے جس کو ان ہی دنیاوی قبروں کے لیے دلیل بنایا۔ آخر میں یہ الفاظ ہیں۔ یہ قبریں اپنے اہل پر اندھیروں سے بھری رہتی ہیں۔ میری دُعا سے اللہ تعالیٰ انہیں نور عرود دیتا ہے۔ اگر اس روایت سے جیسا کہ آپ نے سمجھا ہے اور دُوسروں کو سمجھانے کی کوشش فرمائی ہے، دنیاوی قبر مراد لی جاتے تو ایک ایک قبر میں بے حساب مُردے دفن ہوتے ہیں۔ کوئی اچھا کوئی بُرا ہر ایک کو اس نور سے فائدہ پہنچے گا۔ اس کے بجائے اصل سچائی یعنی برزخ کی قبر مان لیا جاتے تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اس گڑھے کو قبر اور اس میں سوال جواب کے مسئلے کو ثابت کرنے کے لیے

مسلم کے حوالے سے عمرو بن عاصؓ کی مرتے وقت وصیت پیش کی جاتی ہے۔ اول تو مسلم کی اس روایت پر امام نووی نے جرح کی ہے کہ اس کی سند اور اس کے متن میں کلام کیا گیا ہے۔ دیکھیے شرح مسلم نووی ج ۱ ص ۷۶۔ مزید یہ کہ اس کے راوی ابو ماسم صحابہ کا ابن علقمہ کو عقیلی کتاب الضعفاء میں لائے ہیں۔ دیکھیے الضعفاء۔ للعتیقلی ص ۱۷۱۔ میزان اعتدال جلد ۲ ص ۳۲۵

دوسرے یہ کہ یہ سکرات الموت کی بات ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے۔ ”وہو فی سیاق الموت“ ایسے وقت کی بات ہے جب آدمی اپنے آپے میں نہ ہو۔ قرآن اور حدیث کو کیسے جھٹلایا جاسکتا ہے۔ آخر لوگ واقعہ قرطاس کو کیوں بھول جاتے ہیں؟ بخاری کی روایت کے مطابق حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آپؐ پر مرض کی شدت کی وجہ سے بحرانی کیفیت طاری ہے۔ اسی کے زیر اثر آپؐ یہ فرما رہے ہیں، اس لیے لکھوانے کی ضرورت نہیں۔ اسی ذیل میں لوگ بریدہؓ کی وصیت پیش کرتے ہیں جو بخاری جلد ۱۸ ص ۱۸۱ پر موجود ہے۔ یہ بھی ان کی وصیت ہے۔ جس کا کیا اعتبار؟ جسے آپؐ نے مہصل کے ذیل ۵ صفحہ ۲۱۶ میں تحریر فرمایا ہے کہ مرنے کے ساتھ ہی فرشتے مُردے کی رُوح کو آسمانوں کی طرف لے جاتے ہیں، پھر اس وقت واپس لاتے ہیں جب مُردہ قبر میں دفن ہو چکتا ہے۔ اس وقت اس سے سوال اور جواب ہوتے ہیں اور وہ جانے والے آدمیوں کے جو توں کی چاب بھی سنتا ہے اور یہ سب اضطرابی امور ہیں۔ ان میں استثناء یہ ہے کہ جن لوگوں کو قبر نصیب نہ ہو ان پر یہ واردات صرف رُوح پر ہی واقع ہوتے ہیں، گویا کہ آپؐ بھی ردّ رُوح والی روایتوں کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ روایتیں سنداً ضعیف اور نص قرآنی کا انکار کرتی ہیں۔ کیونکہ قرآن کہتا ہے اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَاءِ آپ کے عقیدے کے مطابق مُردہ کے دفن ہوتے ہی رُوح واپس آجاتی ہے۔ گویا مُردہ مُردہ نہ رہا۔ قبر میں پھر زندہ ہو گیا جو قرآن کے خلاف ہے۔ پھر یہ رُوح آخِر دو بارہ واپس گئی بھی یا نہیں؟ اگر آسمانوں میں اُپر واپس چلی گئی تو اس کے لیے آپ کے پاس حدیث کی کونسی دلیل ہے؟ دراصل یہ فتنہ نیا فتنہ نہیں بلکہ اس کے بانی مہابی احمد بن منبہل ہیں جو ردّ رُوح کے قائل ہیں۔ جیسا کہ کتاب الصلوٰۃ

۳۵ صبح قاہرہ میں تحریر ہے :

”پھر ارواح کے قبروں میں جسموں کے طرف لوٹاتے جانے پر ایمان لانا

منزوری ہے“

ان الفاظ کو پڑھیے اور احمد بن حنبل کی بدعتیگی پر سر دھنیے۔ اب بتائیے کون شخص احمد بن حنبل کو مسلمان سمجھ سکتا ہے کیونکہ امام احمد بن حنبل نے ہی اس بدعتیگی کو معاشرہ میں رائج کیا اور امتِ مسلمہ آج تک جس کی سزا بھگت رہی ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ مرنے کے بعد صرف قیامت کے دن ہی انسان زندہ ہوگا۔

ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذَلِكَ لَمَيِّتُونَ ثُمَّ أَنْتُمْ يَُوْمَ الْقِيَامَةِ
تَبْعُونَ۔ سورة المؤمنون ۱۵، ۱۶ اسی طرح سورة البقرة ۲۸
كَيْفَ تَكْفُرُونَ يَا لِلّٰهِ وَكُنْتُمْ اٰمُوۡنًا فَاٰحْيَاكُمْ ثُمَّ لِمَيْتَكُمْ
ثُمَّ لِمَيِّتِكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۰

اسی طرح سورة المؤمن پک ۷۱ میں ہے۔ قَالَ وَاٰرْتَبْنَا اٰمِنًا اٰتَمِّنِينَ
وَ اٰحْيَيْنَا اٰتَمِّتِينَ فَاَعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَاَهْلٰ اِلَىٰ خُرُوْجٍ

مِنْ سَبِيْلٍ ۰

عترم سوچیے دوزندگیوں اور دو موتوں کے بعد تیسری زندگی اور تیسری موت کہاں سے آئی؟ آپ نے تو قبر میں رُوح پٹا کر ایک تیسری زندگی کا جواز نکال دیا۔ جو کھلا قرآن کا انکار ہے۔

اس تضاد کو دور کرنے کا واحد حل یہی ہے کہ مان لیا جائے کہ ہر رُوح کو ایک برزخی جسم ملتا ہے اور وہی اس کی برزخی قبر ہوتی ہے۔ عذاب و ثواب کے تمام احوال اسی پر گزرتے ہیں۔ سوال و جواب بھی برزخی جسم اور برزخی قبر کے اندر ہوتا ہے۔ مگر یہ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ جانے والے آدمیوں کے جو توں کی چاپ بھی سنتا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ دراصل یہ چاپ آدمیوں کی نہیں بلکہ فرشتوں کی ہوتی ہے جیسا کہ بخاری کے شارح ابن المنیر کی شرح ہے جس کو ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں لائے ہیں۔ جس کا مفہوم یہ ہے :

ابن حجر مستطانی نے کہا کہ بخاری کے اس باب باندھنے کے (المیت یسمعون النعال - یعنی مردہ جوتوں کی چاپ سنتا ہے) کے متعلق الزین بن المیر نے کہا کہ مصنف (بخاری) کے اس مضمون کے باب باندھنے سے اُن کی مراد یہ ہے کہ اس طریقہ کو آدابِ دفن میں اولیت حاصل ہے۔ کہ وقار برقرار رکھا جائے۔ شور و شر سے اجتناب کیا جائے۔ اور شدت کے ساتھ پیروں کو نہ مارا جائے۔ جیسے کہ ایک زندہ سونے والے کے لیے ہونا چاہیے اور ایسا لگتا ہے کہ بخاری نے (نبی کے الفاظ سے) یہ نکالا ہے کہ آدمیوں سے جیسا کچھ سنا جاتا ہے ویسا ہی فرشتوں سے بھی سنا جاتا ہے۔ (یعنی اُن کے جوتوں کی آواز)

شاید آپ کا دوسروں کی طرح یہ عقیدہ بھی ہے کہ رُوحیں علیتین اور سبحین میں رُوحی جاتی ہیں۔ یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ علیتین اور سبحین رُوحوں کے رہنے کی جگہ نہیں بلکہ نیکیوں کا رول اور بدکاروں کے اعمال ناموں کے دفتر ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَبَّحْتِنَہُ كِتَابٌ مَّرْقُومٌ ۚ وَنُزِّلَتْ تَوْحِيدًا لِلْمُتَّكِنِينَ ۝ سورة المطففين (آیت ۷، ۸، ۹)، اور كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْأَنْبِيَاءِ لَفِي عَلَيَّتِنَا ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا عَلَيَّتُونَ كِتَابٌ مَّرْقُومٌ ۚ يَشْرَحُهُ الْمُقَرَّبُونَ ۝ صرف یہی نہیں بلکہ مگرہ لوگ سورة اعراف کی یہ آیت بھی پیش کرتے ہیں کہ "ان لوگوں کے لیے جو ہماری آیات جھٹلاتے ہیں اور ان سے استکبار کرتے ہیں آسمان کے دروازے ہرگز نہ کھولے جائیں گے" جو اب اس کا یہ ہے کہ یہ قرآن کی ادیبانہ زبان ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے اعمال ان کی دعائیں اور خود ان کی ہرگز پذیرائی نہ ہوگی۔ ایک دلیل کلام المیت علی الجنائزہ کی بھی پیش کی جاتی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ مردہ ہے۔ زندہ تو نہیں بہر حال اس کا بولنا قرآن کے تشابہات کی طرح ہے۔ اور اس حدیث کی اصل تاویل کسی کے پاس نہیں ورنہ اگر کاندھے کے پاس لو لے تو اٹھانے والا کیوں نہ سنے گا۔ ہم نے آپ کے مضمون کے پیش کردہ دلائل کا بھی تجزیہ کیا۔ اور ان دلائل کی بھی اصل حقیقت آپ کے سامنے رکھ دی۔ جو اس ذیل میں بارہا پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ اب آپ کا فرض ہے کہ یا تو آپ رجوع فرمائیے یا پھر ہمیں کتاب و سنت کی روشنی میں مطمئن کرنے کی کوشش کیجئے۔

امام احمد، امام ابن القیمہ، امام ابن قیم، ابن کثیر، ابن حجر اور ایک جم عفر ہے۔ جو مُردہ جسم میں قیامت سے پہلے رُوح کے واپس آجانے کا قائل اور اسی دنیاوی قبر میں قیامت تک مُردہ پر عذاب یا راحت کے سارے احوال گزرنے کا اقرار ہی ہے۔ دراصل یہی عقیدہ ان سب بڑوں کو کافر اور مشرک بناتا ہے اور دائرۃ اسلام سے خارج کر دیتا ہے دوسری طرف قرآن اور احادیث صحیحہ اجماع صحابہ امام ابوحنیفہؒ اور امام بخاریؒ ہیں جن کا فیصلہ یہ ہے کہ رُوح بدن سے نکلنے کے بعد مُردہ جسم میں قیامت سے پہلے واپس نہیں آسکتی ہے۔

اور نہ دنیاوی جسم سے اس کا کسی قسم کا تعلق باقی رہتا ہے اور یہ قبر کے مُردے بالکل مُردہ ہیں، ان میں جان کی روح تک نہیں ہوتی۔

امت کی بد نفسی ہے کہ آج کیفیت عذابِ قبر کے اس عظیم مسئلہ کو فروغی مسئلہ قرار دینے کی کوشش کی جا رہی ہے، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایمان یا شُرک ایمان بالکتاب اور ایمان بالرسول کا معاملہ ہے۔ جو بھی یہ عقیدہ رکھے کہ دنیاوی قبر کے مُردے میں رُوح واپس آجاتی ہے۔ اسی کو اٹھا کر بٹھا یا جاتا ہے۔ سوال اور جواب ہوتا ہے۔ اور اب اسی پر قیامت تک دنیاوی قبر میں راحت کا دور جاری رہے گا۔ وہ ایمان سے خالی ہے۔

امید ہے کہ پہلی فرصت میں آپ زحمت فرماتے ہوئے تفصیلی جواب سے مطلع فرمائیں گے۔
والسلام (اشفاق)

جوابات

- اس خط کے لب و لہجہ سے ہٹ کر اگر خالص علمی محاسبہ کیا جائے تو میرے خیال میں اختلافی مسائل صرف دو ہیں۔ جو یہ ہیں:
- ۱- قبر کا صحیح مقام کونسا ہے؟ زمینی گڑھا، جس میں میت کو دفن کیا جاتا ہے یا برزخی قبر۔
 - ۲- سماح موتی میں کوئی استنثار بھی ہے یا نہیں؟ بالفاظ دیگر کسی نہ کسی وقت اعادۃ رُوح کا امکان ہے یا نہیں؟
- میں اس بحث میں خاص انحصار پیدا کرنے کی خاطر یہ چاہتا ہوں کہ اس بحث

کو صرف قرآنِ کریم اور بخاری شریف تک محدود رکھوں۔

(۱) مقامِ قبر؟

مقامِ قبر کے متعلق آپ کا نظریہ یہ ہے کہ وہ مقام، جہاں میت کو عذاب و ثواب ہوتا ہے، یہ زمینی کھوکھلا نہیں بلکہ کوئی برزخی مقام ہے جسے آپ برزخی قبر کہتے ہیں۔ یا برزخی قبر سے وہ نیا جسم مراد ہے جو میت کی رُوح کو مرنے کے ساتھ ہی عطا کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس نظریہ کا کتاب و سنت میں کبھی ذکر نہیں۔ صرف استنباطات کے ذریعے لے کر کشید کیا گیا ہے۔ لہذا یہ محض ایک نظریہ ہے۔ جو غلط بھی ہو سکتا ہے اور صحیح بھی۔ بخلاف عقیدہ کے کہ اس کی بنیاد قطعی نصوص شرعیہ یا بالفاظِ دیگر کتاب و سنت کے واضح الفاظ پر ہوتی ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ بھی سامنے رکھیے کہ نظریہ وہ ہوتا ہے جس کی صحت کو مختلف نتائج یا استنباطات کے ذریعے جانچا جاتا ہے جبکہ عقیدہ وہ ہوتا ہے جس کی اپنی حیثیت مسلم اور برقرار ہوتی ہے اور اس سے مختلف نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔

برزخی قبر محض ایک نظریہ ہے!

اب دیکھیے "برزخی قبر" کا ثبوت قرآن یا کسی صحیح حدیث سے ملنا تو درکنار، علمائے معتد میں کی کسی تصنیف میں اس کا ذکر تک نہیں ملتا۔ لہذا یہ محض ایک نظریہ ہے عقیدہ نہیں۔ پھر اس نظریہ کے نہ ماننے کی وجہ سے کسی کو بد عقیدہ، گمراہ یا مشرک و کافر بھی قرار نہیں دیا جاسکتا، جیسا کہ اشفاق صاحب نے مجھے مخاطب کر کے ارشاد فرمایا ہے کہ:

"دوسرے گمراہ لوگوں کی طرح آپ نے بھی قبر سے مراد یہی گدھا لیا ہے جو صحیح نہیں" (آپ کا خط ص ۱)

اور عجب بات یہ ہے کہ خود اشفاق صاحب کو بھی اس برزخی قبر کے محض ایک نظریہ ہونے کا اعتراف ہے۔ چنانچہ وہ اس خط کے ص ۲ پر لکھتے ہیں:

"اس کے بجائے اصلی سچائی یعنی برزخ کی قبر مان لیا جائے تو پھر کوئی مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا"

اشفاق صاحب کے یہ الفاظ ہمارے دعویٰ کا واضح ثبوت ہیں کیونکہ اگر یہ "اصل سچائی" کتاب و سنت میں مذکور ہوتی تو آپ کو اس کے مان لینے کے لیے ایسی التجا کرنے کی ضرورت

قطعاً پیش نہ آتی۔

پھر اسی خط کے ص ۶ پر یوں رقمطراز ہیں،
 ”اس تضاد (یعنی اشفاق صاحب کا اپنا ذہنی تضاد، جس کا آگے چل کر جواب
 دے دیا گیا ہے) کا واحد حل یہی ہے کہ مان لیا جائے کہ ہر رُوح کو برزخی جسم
 ملتا ہے اور وہی اس کی برزخی قبر ہوتی ہے۔ عذاب و ثواب کے تمام احوال
 اسی پر گزرتے ہیں۔ سوال و جواب بھی برزخی جسم اور برزخی قبر کے اندر ہوتا ہے“
 اشفاق صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر اس ”اصل سچائی کو مان لیا جائے تو پھر کوئی مسئلہ
 ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حالانکہ اس ”اصل سچائی کو ماننے سے ایک بہت بڑا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے
 اور وہ یہ ہے کہ جب سمیت کو مرنے کے ساتھ ہی ایک نیا جسم مل گیا، جو کم از کم یوم البعث تک
 قائم و دائم اور عذاب و ثواب سے دوچار رہے گا۔ تو اس رُوح اور جسم کے انصال ہی کا
 نام تو زندگی ہے۔ آخر یہ مستقل اور دائمی زندگی کہاں سے آگئی؟ جبکہ قرآن میں صرف زندگیوں کا
 ذکر آیا ہے؛ اسی طرح اس مستقل اور دائمی زندگی میں مسلسل عذاب کا نظریہ بھی درست نہیں۔
 قرآن میں تو اس برزخ کے عرصہ میں فرعون اور آل فرعون جیسے کافروں کے لیے بھی اَلْكَافِرُ
 يُعَذِّبُكُمْ بِمَا عَصَاكُمْ وَاَوْعَيْتُمْ اَلْكَافِرُ کے الفاظ آتے ہیں جو عذاب کے تسلسل کو ختم کر
 دیتے ہیں۔ لہذا یہ نظریہ صحیح کیسے ہوا؟
 برزخی جسم؛

اس کے بجائے ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ رُوح کو کوئی نیا جسم نہیں ملتا۔ بلکہ اس کا اپنا
 بھی جسم ہوتا ہے۔ فرشتے جب طبعی مرنے والے کی رُوح کو نکالتے ہیں تو یہ رُوح اپنی جسمیت
 سمیت مادی جسم کے بند بند سے نکلکتی ہے۔ پھر فرشتے اسی جسمیت سمیت رُوح کو کپڑے میں
 لپیٹ کر آسمانوں کی طرف لے جاتے ہیں اور رُوح کا یہ جسم مادی جسم میں اسی طرح پھیلا ہوا ہوتا
 ہے، جیسے کولہ میں جبنے والی گیس یا زیون کے درخت میں روغن زیون۔ رُوح کا یہ جسم مادی
 میں بھی موجود تھا۔ جب ”اَلْسُنُ بِرَبِّكُمْ“ کا سوال و جواب ہوا۔ مرحلہ ۲ میں، ملا میں
 اور ۳ میں غرض ہر مرحلہ پر رُوح کا جسم اس کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ البتہ مرحلہ ۲ اور ۳
 میں اسے ایک اضافی مادی جسم بھی ملتا ہے اور اسی اضافی جسم کی وجہ سے ان ہر دو ادوار کو
 زندگی کے ادوار سے تعبیر کیا گیا ہے۔ رُوح کے اسی اپنے جسم کی وجہ سے ہم خواب میں ایک

دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں۔ پھر جس طرح رُوح کا یہی جسم خواب میں رنج و راحت سے دوچار ہوتا ہے، اسی طرح عرصۂ برزخ میں یہی جسم عذاب و ثواب سے دوچار ہوگا۔ رُوح کے اس جسم کو آپ نیا برزخی جسم کہہ لیں تو یہ آپ کی مرضی ہے۔ ورنہ رُوح کا اپنا مستقل جسم ہوتا ہے۔ جس کا عرصۂ برزخ سے چنداں تعلق نہیں۔

رُوح کا یہ جسم سنتا بھی ہے اور بولتا بھی ہے۔ لیکن اس کا یہ بولنا اور سننا ہمارے لیے بے کار ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک خواب دیکھنے والا شخص اپنے خواب میں جو کچھ کہتا یا سنتا ہے۔ اس کے پاس بیٹھے ہوتے جاگنے والے شخص کو اس کی گفت و شنید کا مطلق علم نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان دونوں کا عالم بالکل جداگانہ ہوتا ہے۔

پھر جس طرح خواب میں کوئی شخص انتہائی تکلیف یا انتہائی انبساط میں ہوتا ہے تو اس کے اثرات بعض دفعہ بستر پر لیٹے ہوئے جسم پر بھی نمودار ہو جاتے ہیں اسی طرح عرصۂ برزخ میں عذاب و ثواب سے دوچار ہونے والی رُوح پر جب شدت گزرتی ہے تو اس کے اثرات قبر میں پڑے ہوئے جسم تک بھی نمودار ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ جسم موجود ہو تو، ورنہ نہیں۔ گویا استثنائی صورتیں ہیں، مگر ان سے انکار ممکن نہیں۔ عام قانون یہی ہے کہ جس طرح خواب دیکھنے والے شخص کے رنج و راحت سے اس کا بستر پر پڑا ہوا جسم دوچار نہیں ہوتا، اسی طرح برزخ میں رُوح اور جسم پر جو واردات گزرتے ہیں قبر میں پڑا ہوا جسم اس سے متاثر نہیں ہوتا۔

کیا علیتین اور سجنین برزخی مقام ہیں؟

اشفاق صاحب اور اسی طرح عثمانی صاحب کا خیال ہے کہ علیتین اور سجنین برزخی مقامات نہیں بلکہ وہ صرف رجبستر ہیں جن میں اہل جنت اور اہل النار کے ناموں کا اندراج ہوتا ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ جہاں علیتین اور سجنین کا ذکر آیا ہے۔ ساتھ ہی کتاب مرقوم کے الفاظ سے علیتین اور سجنین کی صفت بیان کی گئی ہے۔ لہذا برزخی مقام دراصل رُوح کا وہ نیا جسم ہی ہے جو اسے مرنے کے ساتھ ہی عطا کیا جاتا ہے۔

ہمیں اس نظریہ سے بھی اختلاف ہے کیونکہ جہاں کہیں بھی یہ رجبستر اندراجا ہوں گے وہ کوئی مقام ہی ہوگا۔ پھر جہاں قرآن میں علیتین کا ذکر آیا ہے۔ وہاں

”کتاب مَرْتُوْمَر کے۔ اَنْهٗ یُشْمِدُهٗ الْمَقْرَبُوْنَ“ کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ یعنی جس مقام پر اہل جنت کا یہ رحبتر ہے، وہاں مقرب لوگ (مرتے ہوئے نیک لوگ یا مقرب فرشتے) بھی موجود ہوتے ہیں۔ اسی طرح جہاں سبحین کا ذکر آیا ہے وہاں کتاب مَرْتُوْمَر کے ساتھ ہی ”وَيَلْمُ يَوْمَئِذٍ الَّذِكَاذِبِينَ“ کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ یعنی اس اندراج کے دن ہی سے ان جھٹلانے والوں کی ہلاکت کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اندریں صورت حال عظیم اور سبحین مقام نہیں تو اور کیا ہے؟ وہ ایسے مقامات ہیں جہاں صرف اہل جنت اور اہل النار کے نام ہی درج رحبتر نہیں کیے جاتے، بلکہ وہی مقام ان روحوں کا اصل مستقر بھی قرار پاتا ہے۔ اور انہی مقامات پر وہ عرصہ برزخ میں عذاب و ثواب سے تاقیامت دوچار ہوتے رہیں گے۔

قبر سے مراد یہی زمینی گڑھا ہے۔

میں نے اپنے سابقہ مضمون ”مراسلات“ میں قبر سے مراد اسی زمینی گڑھا ہونے کے ثبوت میں قرآن و حدیث سے سات دلائل دیے تھے جو یہ ہیں،

۱۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کو عبد اللہ بن ابی منافق کے متعلق خطاب کرتے ہوئے فرمایا، ”وَلَا تَقْرَبْ عَلٰی قَبْرِہٖ“ اب خدا سچ بتائیے کہ یہاں قبر سے مراد اللہ تعالیٰ نے یہی زمینی گڑھا لیا تھا یا آپ کی مرقومہ برزخی قبر؟ نیز خود رسول اللہ اور آپ کے صحابہ نے قبر کے لفظ سے یہ زمینی گڑھا مراد لیا تھا یا برزخی قبر؟ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ کو اس منافق کی اس زمینی قبر پر کھڑا ہونے کو کیوں ناپسند کیا تھا؟

۲۔ رسول اللہ کا مقتولین غلیب بدر کو وہاں پہنچ کر مخاطب کرنا۔ اگر یہ کنواں ان مشرکین کی حقیقی قبر نہ تھا تو آپؐ وہاں گئے کیوں تھے؟ جہاں پہلے موجود تھے، وہیں سے ان برزخی قبر والوں کو مخاطب کر لیا ہوتا؟

۳۔ رسول اللہ کا جنت البقیع میں جا کر شہدائے احد کے لیے دُعا کرنا اور

۴۔ آپؐ کا قبرستان میں یعنی انہی زمینی گڑھوں کے پاس جا کر مُردوں کو ”السلام علیکم“ کہنا اور ان کے لیے دُعا کرنا۔ آخر آپؐ کُھر بیٹھے ہی السلام علیکم کیوں نہیں کہہ لیتے؟ کیونکہ ان کا قبرستان سے تو کوئی تعلق ہے نہیں۔ وہ تو برزخی قبروں میں رہتے ہیں۔

۵ تا ۷ - بخاری شریف سے تین احادیث بمعہ متن، ترجمہ اور حوالہ جن سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ قبر سے مراد یہی زمینی گڑھا ہے، "کو ہی ہم اصل سچائی" قرار دے سکتے ہیں۔ اس کے مقابل برزخی قبر کا نظریہ مؤود قرار پاتے گا۔ اگرچہ ان حضرات کے نزدیک اس کے فرعونہ فرامد کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔

شانوں والی حدیث کا نیا مطلب :

ان سات دلائل میں سے صرف ایک حدیث کا اشفاق صاحب نے جواب دیا ہے اور وہ کرتے بھی کیا کہ اس پہلو سے عثمانی صاحب نے صرف ایک ہی حدیث کا جواب لٹریچر میں لکھا تھا (حدیث یہ تھی کہ :

رسول اللہ بمعہ صحابہ کرام دو قبروں کے پاس سے گزرے۔ جن میں دو تلوں کو عذاب ہو رہا تھا۔ تو آپ نے درخت کی شاخ پھیر کر اُدھی ایک قبر پر اور دوسری اُدھی دوسری قبر پر گاڑ دی۔ اور صحابہ کرام کے پوچھنے پر آپ نے یہ وضاحت فرمائی کہ جب تک یہ ٹہنیاں سوکھ نہ جائیں شاید ان کا عذاب کچھ ہلکا ہو جائے۔ اس کے جواب میں آپ نے لکھا ہے :

”اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح ایک لیکچر دینے والا اپنی زبان سے ایک مسئلہ بیان کرتا ہے اور تختہ سیاہ پر اس کو لکھتا بھی جاتا ہے تاکہ کان سن کر اور آنکھیں دیکھ کر خوب یاد رکھیں۔ اسی طرح آپ نے شاخیں لگا کر سمجھا دیا۔ ہاں سوال کہ یہ شاخیں دنیاوی قبروں پر کیوں لگائیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ برزخ میں صحابہ کرام کو لے جا کر ان کی اصلی قبروں پر لگانا ناممکن تھا۔ دراصل یہ بتانا تھا کہ ان قبروں میں جو مردے دفن کئے گئے تھے ان پر یہ حالات گزر رہے ہیں اور یہ نبی کا معجزہ تھا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ معجزہ کیا تھا؛ نبی کو بذریعہ وحی ایک بات کی اطلاع ملی تو آپ نے یہ اطلاع صحابہ کرام کو بھی دے دی۔ اس میں معجزہ کی کیا بات ہے؛ انبیاء کی نبوت کا اصل مقصد یہی ہے کہ ہر ایسی بات، جس کا انہیں بذریعہ وحی علم ہوتا ہے، وہ امت کو پہنچا دیتے ہیں۔ اسی طرح خیر بدکنے کی اصل وجہ بتلانا۔ یاد دہاکہ کی وجہ بتلانا جو انہیں بذریعہ وحی معلوم ہوتی ہے، انہیں امت کو

بنلانا ہی انبیاء کا کام ہوتا ہے۔ اس میں معجزہ کی عموماً بات ہے کم از کم ہم تو نہیں سمجھ سکے معجزہ تو جب ہوتا اگر صحابہ کرامؓ بھی اس عذاب کو ہرتے دیکھتے یا سُن لیتے۔ معجزہ ہمیشہ وہ ہوتا ہے جو نبی دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے اور دوسرے لوگ اسے دیکھتے ہیں۔ نبی کے بدریغہ وحی علم کو معجزہ کہنا کیسے درست سمجھا جاسکتا ہے؟

اور یہ تختہ سیاہ والی بات بھی خوب رہی۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمینی قبر کو بھی پوری نہیں تو تم از تم آدمی قبر آپ نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ برزخی قبر کا تعلق سننے سنانے سے ہے۔ لیکن جہاں تک دیکھنے دکھانے اور لکھ کر بتانے کا تعلق ہے تو یہ کام اس زمینی گڑھے والے تختہ سیاہ ہی سے لیا جاتے گا۔ پھر اگر بفرض تسلیم اس نظریہ برزخی قبر کو مان بھی لیں تو بھی اس سے اتنا تو بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ اس برزخی قبر سے اس زمینی گڑھے کا کچھ تعلق ہے ضرور۔ جہاں تا کہ عذاب قبر سے متعلق باتیں سمجھائی جاتی ہیں۔ اور یہی کچھ ہم بحثے ہیں!

برزخی قبر کے نظریہ کا استنباط :-

اس نظریہ کا استنباط یوں کیا گیا ہے کہ قرآن میں ہے ”ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ“ یعنی ہر شخص کو مرنے کے بعد قبر ملتی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کو یہ قبور میسر نہیں آتی۔ کچھ لوگ ڈوب جاتے ہیں انہیں پھیلیاں ہڑپ کر جاتی ہیں۔ بعض دوسروں کو حلا کر رکھ بنا دیا جاتا ہے۔ تو انہیں قبر کہاں ملی؟ جبکہ قرآن یہ بتاتا ہے کہ ہر شخص کو قبر ملتی ہے۔ لہذا ”ضرورت ایجاد کی ماں ہے“ کے تحت برزخی قبر کا نظریہ قائم کیا گیا۔ برزخ کا لفظ بھی قرآن کریم میں ایک دو بار آیا ہے اور قبر کا لفظ تو بہت مقامات پر آیا ہے۔ ان دونوں لفظوں کے ملانے سے برزخی قبر کی اصطلاح بن گئی۔ اب اگر یہ نظریہ قرآن و حدیث سے ثابت نہیں ہوتا تو تم از تم الفاظ تو قرآنی ضرور ہیں۔

اور اس نظریہ کو اپنانے کی وجہ یہ بنی کہ حضرات اس سنتِ الہی کہ ”مرنے کے بعد ایسے قبر دی“ میں کسی استثنائے قائل نہیں۔ حالانکہ جہاں تک میرا مطالعہ ہے کوئی سنتِ الہی ایسی نہیں جس میں استثنائے ہو۔ قرآن میں صرف ایک سنتِ الہی

کے متعلق چار مقامات پر آیا ہے کہ "فَلَمَّا تَجِدَ لِسَانَ اللَّهِ تَبْدِيلًا...
وَلَمَّا تَجِدَ لِسَانَ اللَّهِ تَحْوِيلًا" اور وہ سنت الہی ہے کہ جو قوم بد اعمالوں
میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس پر اللہ کا عذاب ضرور آتا ہے۔ لیکن اس موثق سنت میں
بھی اللہ تعالیٰ نے "إِلَّا قَوْمًا يَتُوبُونَ" فرما کر استثناء کی صورت پیدا کر دی ہے۔

اب دیکھیے سنت الہی ہے کہ مرنے کے بعد انسان کو قبر ملتی ہے اور اس
سے بھی زیادہ موثق سنت الہی یہ ہے کہ موت بھی صرف دو بار ہے۔ اور زندگی
بھی دو بار۔ تو پھر جب اس موثق سنت الہی میں استثناء کی صورتیں قرآن سے
ثابت ہیں۔ جیسے کہ میں اپنے مقالہ میں وضاحت سے پیش کر چکا ہوں۔ تو اس
"مرنے کے بعد قبر ملنے کے" قانون میں استثنائی صورتوں کو تسلیم کرنے میں
آخر کیا چیز مانع ہے؛ اور یہ استثنائی صورتیں یہ ہیں کہ کچھ لوگ ڈوب کر مَر
جاتے ہیں، بعض کو درندے پھاڑ کھاتے ہیں، کچھ دوسروں کو جلادیا جاتا ہے۔
اس سب کچھ کے باوجود عام اصول یہی ہے کہ مرنے والے کو اللہ تعالیٰ قبر دیتا ہے
اور ابتدائے آدم سے انبیاء کی یہی تعلیم رہی ہے کہ مردوں کو قبر میں دفن کیا
جاتے۔ اور یہی چیز احترام انسانیت ہے۔ پھر اس سلسلہ میں یہ دلیل بھی پیش کی
جاتی ہے کہ ہر مرنے والے کو مرنے کے ساتھ ہی عذاب و ثواب قبر شروع ہو
جانک ہے اور عذاب و ثواب کے لیے رُوح کے ساتھ جسم ہونا لازمی ہے۔ پھر
جن لوگوں کا جسم ہی باقی نہ رہا ہو انہیں عذاب و ثواب کیونکر ہوگا؛ پھر قرآن میں
فرعون کے ذکر میں یہ بھی آیا ہے کہ اس کے جسم کو نجات دی جائے گی اور یہ بھی
ہے کہ فرعون اور آل فرعون سب کو مرنے کے بعد عذاب پر پیش کیا جاتا ہے
تو ان کی کتبیں کیسے ممکن ہے؛ لہذا ضروری ہے کہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مرنے کے
بعد رُوح کو ایک نیا بدن ملتا ہے۔ اور یہی جسم اس کی بدنہی قبر ہے۔
لیکن ہمارے خیال میں رُوح کو کسی نئے جسم کی ضرورت نہیں۔ رُوح کا اپنا
بھی ایک جسم ہے جس کی تفصیل ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔

قبر کے عام مفہوم پر عثمانی صاحب کے اعتراضات :

قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا لینے پر عثمانی صاحب اور اسی طرح موجودہ دور کے بعض دیگر لوگوں کو مندرجہ ذیل قسم کے اعتراضات ہیں۔

۱۔ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغیچہ ہوتا ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ بعض دفعہ ایک ہی قبر میں کئی مردے دفن ہوتے ہیں۔ اب بتلائیے کہ اس قبر میں عذاب ہو رہا ہے یا ثواب؟

۲۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جب منکر نکیر آتے ہیں تو مردے کو قبر میں بٹھلا دیا جاتا ہے۔ پھر مومن کے لیے یہ قبر کشادہ کی جاتی ہے حالانکہ اس زمینی گڑھے میں اتنی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ لہذا ضروری ہے کہ اس سے برزخی قبر ہی مراد لی جاتی ہے۔

۳۔ حدیث میں آیا ہے کہ بدکردار انسان کو ستر ایسے زہریلے سانپ ڈستے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی زمین کو ڈس لے تو زمین سبزہ آگاہا چھوڑ دے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ زمین نے آج تک سبزہ آگاہا تو چھوڑا نہیں۔ لہذا قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا لینا درست نہیں۔

۴۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ قبریں ظلمت سے بھری ہوتی ہیں۔ میری دعا سے وہ روشن ہو جاتی ہیں۔ اب اگر ایک قبر میں نیک و بد دونوں قسم کے مردے ہوں تو کیا صورت ہوگی؟ کیا ان سب کو اس نور سے فائدہ پہنچے گا؟

۵۔ زانیوں کی قبریں دنیا میں مختلف مقامات پر ہوتی ہیں لیکن رسول اللہ نے خواب میں دیکھا کہ انہیں ایک ہی جگہ ایک نور میں عذاب ہو رہا تھا وغیرہ۔

اعتراضات کے جوابات

یہ اور اس قسم کے دوسرے اعتراضات کا جواب دراصل میں اپنے مقالہ میں دے چکا ہوں۔ مگر معلوم ہوتا ہے، ان حضرات نے اپنے مخصوص قسم کے نکات پر ہی نظر ڈالی۔ لہذا اب اسے ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ فرض کیجئے ایک کمرے میں دو آدمی سو رہے ہیں، اور خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایک تو خواب کی حالت میں پٹ رہا ہے لیکن دوسرا خواب ہی میں دفن میں اٹار رہا ہے اور ایک تیسرا

آدمی ان دونوں کے پاس بیٹھا جاگ رہا ہے۔ اب دیکھئے یہ تینوں آدمی ایک دوسرے اور تیسرے کے حالات سے قطعاً بے خبر ہیں کیونکہ تینوں کے علم الگ الگ ہیں۔ اگرچہ ہمارے محسوسات کے لحاظ سے تینوں ایک ٹمرے میں، ایک مقام پر اور ایک عالم نہ دنیا میں ہیں۔

عالم برزخ کا حضورِ اہم تصور، جتنا کہ اس عالم دنیا میں ممکن ہے، خواب اور اس کے کوائف و واردات میں غور و فکر کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے کیونکہ نیند بھی زندگی اور موت کے درمیان برزخ ہے اور اسی لیے نیند کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ نیند میں چونکہ زندگی کے آثار غالب ہوتے ہیں اس لیے قرآن نے اس دور کو زندگی سے تعبیر کیا ہے اور برزخ میں چونکہ موت کے اثرات غالب ہوتے ہیں اس لیے قرآن نے اسے موت سے تعبیر کیا ہے۔ اگرچہ اس میں کبھی زندگی کے کچھ نہ کچھ آثار پائے جاتے ہیں اسی لیے اس موت کے دور کو برزخِ زندگی بھی کہا دیا جاتا ہے۔

اس تصریح سے عثمانی صاحب کے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ کیا رُوحیں ڈوبیں ایک تو عذاب و ثواب جھکت رہی ہے اور دوسری دنیا میں اپنے قبر میں پڑے ہوئے جسم میں موجود ہوتی ہے تو کیا رُوحیں دم ہوتی ہیں؛ اگر اس دنیا میں اس طرح کی دو رُوحوں کے وجود کا امکان ہے تو اس دنیا میں کیوں نہیں ہو سکتا؛ ایک رُوح سڑے گئے اگلے جسم میں ہوتی اور دوسری آسمانوں کی سیر کرتی پھرتی ہے۔

عثمانی صاحب فرماتے ہیں، حدیث میں آیا ہے کہ بدکردار انسان کو ایسے زہریلے ستر سانپ ڈستے ہیں کہ اگر ان میں ایک سانپ زمین کو ڈس لے تو وہ سبزہ اگانا چھوڑ دے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ زمین نے سبزہ اگانا تو چھوڑا نہیں۔ لہذا قبر سے یہ زمینی گڑھا مراد لینا درست نہیں۔

یہ بھی عجیب قسم کی منطوق ہے کہ سانپ ڈسے تو انسان کو اور سبزہ اگانا زمین چھوڑ دے؛ وہ کیوں؛ آخر اس سانپ نے زمین کو تو ڈسا نہیں، پھر جب ہم خود اس بات کے قائل ہیں کہ عذاب و ثواب قبر کا بیشتر انحصار رُوح یا رُوح کے جسم پر ہوتا ہے۔ البتہ اس کی شدت سے کبھی کبھار قبر میں پڑا ہوا جسم عنصری بھی متاثر ہو جاتا ہے۔ تو بدکردار انسان کے اس مذاق سے آخر زمین سبزہ اگانا کیوں چھوڑ دے؟

یہ اور اس قبیل کے دوسرے اعتراضات میں عام غلطی جو ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بات تو کرتے ہیں رُوح اور عالم برزخ کی، اور اسے پرکھنا چاہتے ہیں انسانی عقل اور محسوسات

سے، حالانکہ یہ بات اصولاً غلط ہے۔ کیونکہ ارث و باری تعالیٰ ہے کہ روح کے متعلق انسان کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ تو پھر اس تھوڑے علم کی بنیاد پر ایک نظریہ قائم کرنا، پھر اس نظریہ کو عقیدہ کارنگ دینا پھر اس میں اتنا تشدد اور تعصب ہو جاتا کہ جو شخص اس نظریہ کے خلاف بات کرے اسے کافر و مشرک کے القاب دے ڈالنا، آخر یہ کس کی دانشمندی ہے؟

شہداء اور عالم برزخ:

شہداء کے متعلق قرآن کریم میں ایک جگہ تو یہ مذکور ہے کہ "انہیں مردہ نہ کہو بلکہ زندہ ہیں" (البقرہ ۱۵۴) اور دوسری جگہ فرمایا کہ "اللہ کی راہ میں مارے جانے والوں کو مردہ گمان بھی نہ کرو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے ہاں رزق دیے جاتے ہیں" اور احادیث کے ثابت ہے کہ شہداء کو سبز رنگ کے پزندوں کا جسم عطا کیا جاتا ہے۔ وہ جنت کے باغوں میں اہلہاتے، جنت کے میوے کھاتے اور عرش الہی کے نیچے لٹکتی ہوئی سنہری قندیلوں میں بسیرا کرتے ہیں۔ (البداء و بحوالہ مشکوٰۃ ص ۳۲۵)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد برزخی زندگی تو سب ہی کو ملتی ہے خواہ وہ مومن ہو یا کافر۔ اسی طرح ہر کوئی عذاب و ثواب سے بھی دوچار ہوتا ہے تو پھر شہداء کی خصوصیت کیا رہی؟ کیا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ انہیں مردہ نہ کہو یا نہ سمجھو محض ازراہ اعزاز ہے؟

ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ بات محض ازراہ عزت و احترام نہیں۔ بلکہ وہ فی الحقیقت زندگی کے دور میں ہیں جیسا کہ قرآن میں دونوں مقامات پر "بَلْ أَحْيَاءُ" کے الفاظ آتے ہیں جبکہ باقی سب انسانوں کے لیے "أَمْوَاتٌ خَيْرٌ أَحْيَاءُ" کے الفاظ آتے ہیں۔ اور شہداء کی فضیلت یہ ہے کہ ان پر سے مرحلہ مٹ یعنی مرنے کے بعد سے لے کر یوم البعث تک کا دور۔ جسے برزخی زندگی بھی کہتے ہیں اور قرآن اسے موت کا دور بتلاتا ہے، یکسر اٹھایا جاتا ہے اور وہ مرحلہ مٹ یعنی دنیوی زندگی میں شہادت پاتے ہی فوراً سیدھے مرحلہ مٹ یعنی مکمل اور دائمی زندگی کے دور میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان سے منکر تعمیر کے سوال و جواب نہیں ہوتے۔ قرآن کریم کے الفاظ "بَلْ أَحْيَاءُ" کا یہی مطلب ہے جبکہ عثمانی صاحب شہداء کی برزخی زندگی تسلیم کرتے ہیں۔ جیسا کہ وہ فرماتے ہیں:

”اس طرح سے صاف بتلادیا گیا کہ شہداء اپنے رب کے پاس ہیں اور وہاں رزق پارہے ہیں۔ ان قبروں کے اندر زندہ نہیں۔ ان کی زندگی برزخی ہے دنیاوی نہیں“ (یہ قبریں یہ آستانے ص ۱۰)

اب سوال یہ ہے کہ اگر شہداء کی زندگی بھی برزخی ہے اور عام انسانوں کی بھی، تو عام انسانوں کے لیے آسواتِ غیورِ آخیا پر اور شہداء کو ”بئس آحیاء“ کیوں کہا گیا؟

موت کے بعد شہداء اور عام انسانوں میں دوسرا فرق یہ ہے کہ شہداء کو جنت میں سبز پرندوں کا جسم عطا ہوتا ہے اور یہ جسم حقیقی اور مستقل ہوتا ہے جبکہ دوسروں کی رُوح کو ان کا اپنا ہی جسم یا بقول عثمانی صاحب نیا جسم عطا ہوتا ہے جو ہر آن بنتا بگڑتا رہتا ہے۔

۲- اعادۃ رُوح اور عذابِ قبر

اعادۃ رُوح کے متعلق جتنی بھی احادیث آتی ہیں، عثمانی صاحب نے ان کو یا تو محروح و موضوع قرار دیا ہے یا پھر ان کی کوئی نئی اور مضحکہ خیز تاویل پیش کر دی ہے۔ اثباتِ اعادۃ رُوح کے موضوع پر ایک الگ مفیظ شائع ہو چکا ہے جس میں عثمانی صاحب کی ان علمی تحقیقات کا بھرپور جائزہ پیش کیا گیا: ”مردمت ہم صرف بخاری کی اسی حدیث سے تعرض کریں گے جو موضوع زیر بحث میں اکثر پیش کی جاتی ہے۔ پھر اس سے ممکنہ نتائج پر غور کریں گے۔ حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ :

”أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا أُوضِعَ فِي قَبْرِهِ وَتَوَلَّى عِنْدَ أَصْحَابِهِ إِنَّهُ لَيَسْمَعُ قُرْعَ نَعَالِهِمْ
 أَتَاهُ مَلَكَانِ فَيَقْعِدَانِهِ فَيَقُولَانِ مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي هَذَا الرَّجُلِ لِمُحَمَّدٍ فَأَمَّا الْمُؤْمِنُ فَيَقُولُ أَشْهَدُ أَنَّ
 عَبْدَ اللَّهِ وَرَسُولُهُ فَيَقَالُ لَهُ انْظُرْ إِلَى مَقْعَدِكَ مِنَ النَّارِ قَدْ أَبَدَ لَكَ اللَّهُ بِهِ مَقْعَدًا مِنَ الْجَنَّةِ فَيَرَاهُمَا
 جَمِيعًا۔ قَالَ فَتَادَةٌ وَذِكْرُ كُنَا أَنْتَ لَيْفَسَحَ لِي فِي قَبْرِهِ ثُمَّ

وَجَعَلَ إِلَىٰ حَدِيثِ أَنَسٍ قَالَ: وَأَمَّا الْمَنَافِقُ وَالْكَاذِبُ فَيُقَالُ لَهُ مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي هَذَا الرَّجُلِ فَيَقُولُ: لَا أَدْرِي، كُنْتُ أَقُولُ مَا يَقُولُ النَّاسُ فَيُقَالُ لَهُ لَا دَرِيَّتَ وَلَا تَكَلَيْتَ فَيَضْرِبُ بِمِطْرَارِقٍ مِنْ حَدِيدٍ صَرَبَةً فَيَمِصُّهَا صَيْحَةً تَسْمَعُهَا مَنْ يَلِيهِ عِزُّ الثَّقَلَيْنِ“ (بخاری، کتاب الجنائز۔ باب ماجاء فی عذاب القبر)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ، جب آدمی اپنی قبر میں رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھی واپس لوٹتے ہیں تو بلاشبہ وہ ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے (اسی وقت اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں جو اُسے اٹھا کر بٹھا دیتے ہیں اور کہتے ہیں: ”تو اس شخص یعنی محمدؐ کے بارے میں کیا اعتقاد رکھتا تھا؟“ اب اگر وہ ایماندار ہے تو کہتا ہے، کہ ”میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں“ پھر اس سے کہا جاتا ہے۔ ”تو دوزخ میں اپنا ٹھکانا دیکھ لے اللہ تعالیٰ نے اس کے بدل تجھ کو جنت میں ٹھکانا دیا۔“ تو وہ ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھے گا۔ قتادہ کہتے ہیں ”اور ہم سے یہ بھی بیان کیا گیا کہ اس کی قبر کشادہ کر دی جاتی ہے۔“ پھر انس کی حدیث بیان کرتے ہوئے کہا ”اور اگر وہ منافق یا کافر ہے تو اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تو اس شخص کے بارے میں کیا اعتقاد رکھتا ہے؟“ تو وہ کہتا ہے۔ ”میں نہیں جانتا۔ میں تو وہی کچھ کہتا تھا جو لوگ کہتے تھے۔“ پھر اس سے کہا جاتے گا کہ نہ تو خود سمجھا اور نہ ہی خود پڑھا۔“ اور لوہے کے ہنٹروں سے اسے ایسی مار پڑے گی کہ وہ بلبلا اٹھے گا۔ اور اس کی یہ چیخ جتن د انسان کے سوا تمام آس پاس کی چیزیں سنتی ہیں“

اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور سامنے آتے ہیں:

۱۔ بنیادی طور پر ”وَضَعُ“ کا لغوی معنی ”آنا اور نیچے رکھنا ہے۔ (مفردات لغویہ) اور ”وَضَعُ فِي قَبْرِهِ“ کے الفاظ اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ قبر سے مراد یہی زمین

گڑھا ہے۔ رُوح کو حسی برزخی جسم میں داخل کرنے کے لیے ”وَضِعَ“ کا لفظ استعمال نہیں ہوگا۔

۲۔ ”وَتَوَلَّىٰ عَنَّا اَحْصَابُهُ“ کے الفاظ سے بھی قبر سے مراد زمینی گڑھا ہے کیونکہ میت کے ساتھی اسی زمینی قبر سے واپس جاتے ہیں نہ کہ برزخی قبر سے۔

۳۔ جن وانس کے سوا تمام اشیاء میت کے عذاب آہ و بکا کو سہتی ہیں۔ جنوں کے متعلق ہم وثوق سے کہہ نہیں سکتے۔ لیکن انسان تو اسی زمین پر بستے ہیں اور مَمْنُتٌ

يَلْبَسُهُ“ کے الفاظ سے یہ بھی واضح ہے کہ یہ اس قبر کے آس پاس کی اشیاء اور

جن وانس ہیں۔ اب انسان چونکہ اسی زمین کے پاس ہو سکتے ہیں۔ برزخی قبر کے پاس نہیں ہوتے۔ لہذا قبر سے مراد یہی زمینی گڑھا ہے۔

”اِنَّهُ لَيَسْمَعُ قَوْلَ عِبَادِهِ“ (یعنی مُردہ ان واپس جانے والوں کے

جو توں کی آواز سنتا ہے) کے الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اس وقت اس

جسم میں رُوح بھی ہوتی ہے جو موت کے وقت فرشتے نکال کر لے گئے تھے۔

اس سے اعادۂ رُوح کا اثبات ہوتا ہے۔ اب یہ سوال کہ رُوح فرشتے اپنے

ساتھ لاتے ہیں۔ یا یہ رُوح ان کی آمد سے پہلے لوٹانی جاتی ہے۔ اور پھر یہ رُوح

واپس کب اور کس طرح جاتی ہے، ایسے سوال ہیں جن کے جاننے کے ہم مکلف

نہیں ہیں۔ اور یہ سوال ایسے ہی ہیں جیسے کوئی یہ پوچھے کہ عیسیٰ ابن مرדوں کو

زندہ کرتے تھے، وہ دوبارہ کب مرتے تھے؟ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ رُوح کا

اصل ٹھکانا یہ دنیاوی قبر نہیں ہے اور رُوح کی یہ واپسی ایک اضطراری امر اور

اللہ کے حکم کے تحت ہے۔

۵۔ ”فَيَقْعِدَ اِيْهِ“ یعنی وہ دونوں فرشتے قبر میں لیٹی ہوئی میت کو اٹھا کر بٹھلا

دیتے ہیں۔ فرشتوں کے اس عمل سے بھی قبر کے زمینی گڑھا ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

کیونکہ برزخی قبر تو محض رُوح کو ایک نیا جسم ملنے کا نام ہے اور یہی نیا جسم اس کی

برزخی قبر ہے۔ اس برزخی قبر میں فرشتوں کے میت کو اٹھا کر بٹھلانے کا تصور ہی

کب پیدا ہوتا ہے؟

۶۔ ”قبر میں فرشتے لیٹی ہوئی میت کو اٹھا کر بٹھلا دیتے ہیں۔ نیز مومن کے لیے قبر

کھول دی جاتی ہے۔“ اس سے عثمانی صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ چونکہ قبر کو اسی

وقت اکھاڑنے سے ہم کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں دیکھتے۔ لہذا قبر سے مراد زمینی گڑھا نہیں ہو سکتا اور اس سے مراد بس برزخی قبر ہی ہو سکتی ہے۔ حالانکہ اس سے بالکل دوسرا نتیجہ نکالتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ قبر کی اندرونی دنیا، اس کی خارجی دنیا سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ قبر میں رکھی ہوئی میت سے بخواروات و عوارض پیش آ رہے ہوتے ہیں۔ اس سے قبر کو اکھاڑنے والا شخص کبھی مطلع نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھنے والا شخص اپنے خواب میں نہایت سلسلی خیز حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ لیکن اس کے پاس بیٹھنے اور جاننے والے کو اس کا علم تک نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ دونوں اسی دنیا میں اور ایک ہی جگہ پر ہوتے ہیں۔ لہذا برزخی قبر کے نظریہ کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اور یہ بات میں پہلے بھی کئی بار واضح کر چکا ہوں کہ اس دنیا میں خواب میں رنج و راحت سے دوچار ہونے والی رُوح کا اپنے مادی جسم سے نہایت گہرا اور قریبی تعلق ہوتا ہے۔ لہذا اس پر زندگی کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن قبر یا عالم برزخ میں اس رنج و راحت سے دوچار ہونے والی رُوح کا اپنے جسم سے تعلق نہایت مُزور اور کبھی کبھار ہوتا ہے۔ پھر یہ تعلق بھی رُوح کے اپنے بس کی بات نہیں ہوتی۔ لہذا اس دُور کو اَسْوَاتٌ غَیْبٌ اَحْیَاءٌ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۷۔ امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں یہ روایت درج کر کے ثابت کر دیا ہے کہ وہ قبر میں اعادۂ رُوح کے قائل ہیں۔ پھر انہوں نے یہ روایت ایک ممتاز صحابی حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کی ہے جس سے معلوم ہوا کہ حضرت انسؓ بن مالک بھی اعادۂ رُوح کے قائل تھے۔ پھر درمیان میں جتنے حضرات سے اس کا سلسلہ سند منسلک ہے، یہ سب حضرات بھی اعادۂ رُوح کے قائل تھے۔ پھر آخر امام احمد بن حنبلؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام ابن قیمؒ، ابن کثیرؒ ابن حجرؒ اور ایک جرمِ غفیرؒ نے کونسا ایسا جرم کیا ہے جس کی پاداش میں آپ انہیں بد عقیدہ، گمراہ، کافر و مشرک اور ایمان سے خالی وغیرہ وغیرہ القابات سے نوازتے ہیں؟ اب آپ کے مددِ حلیں میں سے ایک امام ابو حلیفہؒ رہ جاتے ہیں جن کے سوال و جواب کو غلط جاہر پہنایا جا رہا ہے۔ جہاں تک رُوح کے قبر میں واپس آنے اور پھر ہر وقت موجود رہنے کا تعلق ہے، اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔

اصل سوال زیر بحث یہ ہے کہ کیا کسی وقت اعادۂ روح ممکن ہے یا نہیں، خواہ بعض استثنائی صورت میں ہی کیوں نہ ہو؟ اس سوال کے جواب میں کسی صحابی، امام بخاری یا امام ابو حنیفہؒ کا قول پیش فرمائیے۔ توقع نزاع کے لیے دلیل کا کام دے سکتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے واقعہ سے تو بس اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ رُوح قبر میں پوچھ نہیں ہوتی۔ بلکہ اہل قبور "أَهْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ" ہوتے ہیں۔ اور یہ بات ہم بھی تسلیم کرتے ہیں۔

اسی طرح آپ کسی صحابیؒ، امام بخاریؒ یا امام ابو حنیفہؒ، بلکہ ان کے علاوہ علمائے متقدمین میں سے کسی ایک کا نام بتلا سکتے ہیں جس نے قبر سے مراد یہ زمین گڑھا لینے کی بجائے آپ کی مرمومہ برزخی قبر لیا ہو؟

ہم نے یہاں بخاری سے صرف ایک حدیث عذابِ قبر سے متعلق درج کی ہے جبکہ دوسری کتب صحاح میں بھی ایسی صحیح روایات موجود ہیں۔ پھر ایسی صحیح روایات کے علی الرغم ہم اس استثنائی صورت سے کیسے انکار کر سکتے ہیں کہ اسی زمینی قبر میں فرشتے آتے ہیں تو میت کی رُوح واپس قبر میں لوٹائی جاتی ہے۔ اسی زمینی گڑھے میں فرشتے سوال و جواب کرتے ہیں اور یہیں سے میت کو عذاب و ثواب شروع ہو جاتا ہے۔ ہم میت کے جسم سے اس کی رُوح کے اس استثنائی، کمزور اور غیر مستقل تعلق سے کیسے انکار کر سکتے ہیں جبکہ ہم اس دنیا میں خواب کی صورت میں اس سے ملتی جلتی باتیں مشاہدہ بھی کر لیتے ہیں اور یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا ہے ہی نہیں؟ اسی طرح اس زمینی گڑھے میں ہونے والے سوال و جواب اور عذاب و ثواب سے قطعی انکار ہمارے لیے ناممکن ہے۔

تَرْجَمَ نِعَا لِهَمَّةَ عِثْمَانِي تَشْرِيحًا؛

"تَرْجَمَ نِعَا لِهَمَّةَ" کی شرح میں آپ کو بخاری کے کسی شارح الزین بن المنیر کی شرح بہت پسند آئی ہے اور اس شرح کا اشتقاق صاحب نے بھی اپنے خط میں ذکر

لہ کہ ہم سابع موتی کے مسئلہ میں ان سب حضرات سے کئی طور پر متفق نہیں۔ تاہم ہم ان کے لیے ایسے غلط قسم کے القابات کسی صورت پسند نہیں کرتے۔

فرمایا ہے۔ اور وہ شرح یہ ہے کہ "نِعَالِهِمْ" میں "هُم" کی ضمیر بعد میں آنے والے الفاظ "أَنَا مَلَكَانِ" کی طرف پھرتی ہے۔ اب اس تشریح پر پھر اعتراض بھی وارد ہوتے تھے۔ جن کے جواب بھی عثمانی صاحب نے دیے ہیں۔ ان میں سے پہلے دو اعتراضات اور ان کے جوابات چونکہ طبعی انداز کے ہیں، اس لیے ہم ان کا جلد نذر لینا چاہتے ہیں۔

اعتراض ۱۔ "هُم" جمع کی ضمیر ہے۔ اگر اس سے مراد فرشتے ہوتے تو تشبیہ کی ضمیر "هُمَا" آنا چاہیے تھی۔

اس کا جواب عثمانی صاحب یہ دیتے ہیں کہ "عربی زبان میں دونوں طریقے راجح ہیں۔ تشبیہ کے لیے جمع کا استعمال عام ہے جیسے قرآن کی آیت ہے:

"قَالَ كَلَّا فَإِذْ هَبَا پَايِلْتَنَا أَنَا مَعَكُمْ مُسْتَمْعِنُونَ" (شع ۱۶)

"فرمایا، تم دونوں جاؤ ہماری نشانیاں لے کر۔ ہم تمہارے ساتھ سب کچھ سنتے رہیں گے"

"فَإِذْ هَبَا" میں تشبیہ کی ضمیر ہے اور "مَعَكُمْ" میں جمع کی۔

اسی طرح بخاری کی حدیثِ حضرت میں یہ الفاظ ہیں:

"فَمَرَّتْ بِرِهْمَا سَفِيلَتُهُمَا فَكَلَّمُوهُمَا أَنْ يَحْمِلُوهُمَا"

"پس گزری ان دونوں (موسیٰ و خضر) کے پاس سے ایک کشتی، پس انہوں نے (جمع کا صیغہ) کشتی والوں سے بات کی کہ وہ ان دونوں کو کشتی

میں سوار کر لیں" (بخاری عربی جلد ۲۳، سطر ۱۱۵، ۱۶)

"فَكَلَّمُوهُمَا" کے ساتھ ساتھ "فَكَلَّمَا هُم" بھی بخاری کی روایت میں ہے

مگر حاشیہ پر اور نسخہ کے طور پر متن میں "كَلَّمُوهُمَا" کو ہی ترجیح دی گئی ہے۔ تشبیہ کے بجائے جمع کا صیغہ ہے۔

جواب:

عربی زبان میں تشبیہ کے لیے جمع کا صیغہ عام نہیں۔ اگر عام ہوتا تو گرامر کی کتابوں میں اس کا ضرور ذکر پایا جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ تشبیہ کی صورت میں جمع کا استعمال شاذ ہے اور اس کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے مثلاً:

پہلی مثال میں "كَلَّمُوهُ" کی ضمیر "مَع" کی وجہ سے آئی ہے۔ گویا فرعون کی طرف

جانے والے تو صرف دو تھے مگر سننے والوں میں اللہ بھی ساتھ شامل ہو گیا اور ضمیر جمع میں بدل گئی۔ دوسری مثال میں ایک مقام پر "كَلَّمُوهُمْ" اس لیے آیا ہے کہ موسیٰ کے ساتھ ان کا ایک ساتھی (یوشع بن نون) بھی تھا۔ جس کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے۔ لیکن قابل ذکر چونکہ دو ہی ہستیاں تھیں یعنی موسیٰ و نضر، اس لیے اکثر تثنیہ کا ضمیر آیا اور ایک جگہ اشتباہ کی وجہ سے جمع کا ضمیر بھی آیا۔ اگرچہ اس کی حاشیہ میں تفسیح کر دی گئی۔

اعتراض ۱: "هُم" کی ضمیر "الْمَلَكَانَ" سے متعلق ہے تو یہ پہلے کیسے آگئی؟ اس کا

جواب عثمانی صاحب یوں دیتے ہیں کہ:

عربی ادب کا یہ قاعدہ ہے کہ اگر بات بالکل صاف ہو اور سننے والے سے غلطی کرنے کا کوئی اندیشہ نہ ہو تو پہلے اسم کا ذکر نہیں کیا جاتا جیسے قرآن

میں ہے:

"إِنَّا أَنْشَأْنَاهُنَّ إِنثَاءً فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَارًا" (البقرہ ۳۵، ۳۶)

"ہم نے ان کو (ان کی بیویوں کو) ایک خاص اٹھان سے اٹھایا ہے اور ہم ان کو رکھیں گے کنواریاں۔"

یا سورہ یسین میں:

"وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ" (یسین ۱۹)

"اور ہم نے اس (پیغمبر) کو شعر کی تعلیم نہیں دی"

جواہر کی پہلی مثال اس لحاظ سے غلط ہے کہ "إِنَّا أَنْشَأْنَاهُنَّ" سے چند آیات پہلے "حَوْرٍ عَيْنٍ كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ عِ الْمَكْنُونِ" کا ذکر آچکا ہے۔ بعد میں جنت کی چند صفات بیان کر کے "أَنْشَأْنَاهُنَّ" کی ضمیر "حَوْرٍ عَيْنٍ" کی طرف پھری گئی ہے جو درست ہے۔ لیکن عثمانی صاحب اسے خواہ مخواہ "أَبْكَارًا" کی طرف پھیرنا چاہتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ یہ لفظ بعد میں آیا ہے۔

جواہر کی مثال تو ایسی درکار تھی کہ ضمیر پہلے آئے اور اس کا مرجع اسم بعد میں ہو۔ پہلی مثال میں آپ نے بعد میں مرجع "أَبْكَارًا" جو بتلا یا ہے، وہ ویسے ہی غلط ہے اور دوسری مثال میں ضمیر کا مرجع اسم مذکور ہی نہیں۔ تو ڈاکٹر صاحب کا جواب

درست کیے سمجھا جائے؛

اب دیکھیے کہ ”قَمَعَ بَعَالَهُمْ“ کا مرجح ”اصْحَابُهُ“ واضح طور پر جب موجود ہے تو ”هُنْمٌ“ کا مرجح آخر ”مَلَكَانِ“ کیوں قرار دیا جائے؛ لیکن ان سب باتوں کے باوجود آپ کو الزین بن الہیتر کی تشریح اس لیے پسند آگئی کہ یہ آپ کے نظریہ کی تائید کرتی تھی۔

سماح موتی کے متعلق قولِ قصیل:

قرآن کی رُو سے یہ ثابت ہے کہ مُردے سن نہیں سکتے اور ہم خود بھی اسی بات کے قائل ہیں! — پھر قرآن ہی کی رُو سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس قانونِ الٰہی میں بھی استثناء موجود ہے اور وہ استثناء یہ ہے کہ ”إِنَّ اللَّهَ يَسْمَعُ مِمَّا بَيْنَا“ یعنی ”اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سُننا سکتا ہے“ اب اگر سماح موتی کا یکسر انکار کر دیا جائے تو ”سماح موتی“ کا از خود انکار ہو گیا۔ گویا یہ مسئلہ صرف ”سماح موتی“ کا نہیں بلکہ ”سماح موتی“ کا بھی ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ مُردوں کو سُننا تو سکتا ہے مگر سُننا یا کہی نہیں تو یہ بات بھی یکسر غلط ہے۔ قلبِ بدر کے مقتولین کو اللہ تعالیٰ نے سُننا دیا تھا۔ یعنی اللہ کے اذن سے مُردوں کو ”حُفْمٌ“ کہتے تھے تو وہ مُردے یہ حکم سُن کر ہی جی اٹھتے اور اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ گویا ایسے واقعات کا اندازہ معجزانہ ہی سہی لیکن ان کا انکار تو نہیں کیا جاسکتا۔ پھر چونکہ ”سماح موتی“ اور ”سماح موتی“ دونوں لازم و ملزوم ہیں لہذا ”سماح موتی“ بھی استثنائی صورتوں میں وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔ گویا عام قاعدہ یہی ہے کہ مُردے سُن نہیں سکتے۔

نظریہ ”برزخی قبر“ کو مان لینے کا فائدہ اور ضرورت؛

عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ:

”دنیاوی قبر میں عذابِ قبر کا اثبات ”حیات فی القبر“ کے ہم معنی اور قبر پرستی کے شرک کی اصل اور بنیاد ہے“ (عذابِ قبر ص ۲۶)

اب دیکھیے جہاں تک شرک کی اصل بنیاد کے استیصال کا تعلق ہے، ہم بدل و جان عثمانی صاحب کے ساتھ ہیں۔ اختلاف صرف یہ ہے کہ وہ شرک کی اصل بنیاد اس دنیاوی قبر میں عذابِ قبر کا اثبات اور حیات فی القبر قرار دیتے ہیں جبکہ ہم شرک کی اصل بنیاد سماح موتی کا علی الاطلاق وقوع قرار دیتے ہیں۔ اور اس کی وجوہ

درج ذیل ہیں:

- ۱- قبر میں زندگی اضطرری امور سے تعلق رکھتی ہے۔ دائمی اور مستقل ہرگز نہیں ہوتی۔ میت یا اس کی روح کا اس میں کچھ اختیار یا عمل دخل نہیں ہوتا۔
- ۲- پھر یہ نامکمل سی زندگی بھی ایسی ہے جس کا صحیح فہم ہمارے عقل و حواس سے ماورا ہے۔ کیونکہ وہ عالم اور ہے اور یہ عالم اور۔ لہذا ان کی یہ زندگی بے کار ہے۔ نہ ہم انہیں کچھ سنا، یا بتلا سکتے ہیں۔ نہ وہ ہماری بات سن سکتے ہیں اور نہ ہی وہ ہمیں کچھ سنا، یا بتلا سکتے ہیں یا جواب دے سکتے ہیں تو پھر ان کی زندگی کا ہمیں کیا فائدہ یا نقصان ہے؟ ان کی اس زندگی میں اللہ تعالیٰ یا اس کے حکم سے فرشتے ہی انہیں کچھ سنا، یا وہ ان سے کچھ سن سکتے ہیں یا سوال و جواب کر سکتے ہیں۔ گویا اصل مسئلہ جو شرک کی بنیاد بنتا ہے وہ سماع موتی کا ہے نہ کہ دنیوی قبر میں عذاب اور حیات فی القبر! ————— لہذا ہماری گزارش ہے کہ آپ حضرات! اپنی جملہ مساعی سماع موتی کی تردید میں صرف سمجھتے۔ ان شاء اللہ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔



سماع موتی سے تصرفاتِ اولیاء تک

مسائل (۳)

بلسلہ روح، عذابِ قبر اور سماعِ موتی

(یہ جوابات محدث کی تین اقساطِ جمادی الآخِرہ، صبح اور شعبانِ رمضان ۱۴۰۵ھ میں شائع ہوئے)

سماعِ موتی سے بیکسرا کر کرنے والوں کے بعد اب سماعِ موتی کے قائلین کی طرف سے اعتراضات کی باری آتی۔ اس سلسلہ میں چوہدری محمد علی صاحب حنفی (پکا ڈیرہ و ٹرانچال کورٹ رنجیت ضلع شیخوپورہ) کی طرف سے ادارہ محدث کے نام ایک طویل ترین خط موصول ہوا۔ جو خط سے زیادہ مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ساتھ ہی آخر میں یہ آرزو بھی کی گئی ہے کہ:

”آخر میں میں امید کرتا ہوں کہ ادارہ ”محدث“ جو کتاب و سنت کی روشنی میں آزادانہ بحث و تحقیق کا حامی ہے، تصویر کا دوسرا رخ بھی شائع کرنے کی زحمت گوارا کرے گا۔ تاکہ ”محدث“ کا مطالعہ کرنے والے حق و باطل کو خود پرکھ سکیں“

یہ خط یا مضمون فل سکیپ کے مکمل دس صفحات پر پھیلا ہوا ہے، تحریر گنجان ہے جو محدث کے طم و میث ۲۵ صفحات کا متقاضی ہے۔ پھر اسی قدر یا اس سے کچھ زیادہ صفحات جواب کے لیے بھی درکار تھے۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ ۲۸ صفحات پر مشتمل ایک ماہوار رسالہ ایک قسط میں تو یہ سب کچھ شائع نہ کر سکتا تھا۔ اور اگر ایک قسط میں صرف یہ خط یا مضمون شائع کیا جاتا اور اگلے پرچے میں جوابات دیے جاتے، تو قارئین کو تقابل میں دقت محسوس ہوتی۔ اور اگر خط کا محض خلاصہ میں اپنی طرف سے

پیش کر کے اس کے جوابات قلمبند کر دیتا۔ تو مضمون نگار کی طرف سے اعتراضات کی گنجائش باقی رہتی۔ لہذا مضمون نگار کی آرزو کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس مکمل خط یا مضمون کو بائیں صورت شائع کیا جائے کہ پہلے اس کا ایک حصہ من و عن نقل کر دیا جائے پھر اس کا جواب لکھ دیا جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر یہ مکمل مضمون بغير جوابات دو یا تین اقساط میں بھی شائع ہو، تو قارئین وارد شدہ اعتراضات کے ساتھ ساتھ ان کے جوابات بھی ملاحظہ فرما سکیں گے۔ جواب لکھنے میں میں نے حتی الوسع اختصار سے کام لیا ہے اور صرف ان باتوں کا جواب دیا گیا ہے جن کا جواب دینا ضروری تھا اور جن پر حواشی کے نشانات لگا دیے گئے ہیں۔ پھر اسی ترتیب سے ان کا جواب بھی لکھا گیا ہے۔ جبکہ اصل مضمون کا من و عن شائع کرنا اس لیے ضروری تھا کہ صاحب مضمون کو یہ حسرت نہ رہ جائے کہ ان کا مضمون قطع و برید کے ساتھ یا تو ٹرمر و ٹر کر شائع کیا گیا ہے۔

(عبد الرحمن کیلانی)

سَمَاعِ مَوْتِي - تَصْوِيرِ كَادُوسَرَاحِ

مکھی ایڈیٹر صاحب ماہنامہ "محدث" لاہور

سلام مسنون! چند ماہ سے آپ کے رسالہ "محدث" کا باقاعدگی سے مطالعہ کر رہا ہوں اور محدث میں چھپنے والے معیاری علمی مضامین سے کافی متاثر ہوں۔ اس وقت میرے سامنے آپ کے ماہنامہ "محدث" بابت ماہ دسمبر ۱۹۸۳ء، ماہ جنوری ۱۹۸۴ء کے شمارے ہیں۔ جن میں جناب مولانا عبد الرحمن کیلانی صاحب کا مضمون "روح، عذاب، قبر، سماعِ موتی"، قسط وار شائع ہوا ہے۔ جس میں کیلانی صاحب نے قائلین سماع کے دلائل سے مجرمانہ سلوک کیا ہے۔ اسی سلوک نے مجھے آپ کو خط لکھنے کا حوصلہ بخشا ہے تاکہ کیلانی صاحب کو ان حقائق سے روشناس کرایا جائے، جنہیں مولانا موصوف نے جان بوجھ کر نظر انداز کیا ہے۔

عہ اس کتاب میں ترتیب بدل دی گئی ہے اور پیش لفظ میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے

مولانا کیلانی صاحب نے قرآن مجید کی چند آیات اور چند احادیث کے حوالہ سے جو رائے قائم کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

سماع موٹی ایک تحقیقی مسئلہ ہی نہیں بلکہ شرک کا چور دروازہ ہے (گویا قائلین سماع مشرک ہیں۔)

غائب شدہ بزرگوں کو پکارنا ان کی عبادت کے مترادف ہے۔ غیب یافتہ شدہ بزرگ کسی کی پکار کر جواب دینا تو درکنار ان کی بات بھی نہیں سن سکتے۔ قبروں میں پڑے ہوئے لوگ زندہ نہیں بلکہ بے جان اور مردہ ہیں اور انہیں اپنی ذات سے متعلق بھی کچھ علم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے؟

اس مسئلہ میں قرآن اول میں اختلاف موجود تھا۔ حضرت قتادہ اور حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما سماع موٹی کے منکر تھے۔ قلیب بدر والی حدیث حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہما کے نزدیک صحیح نہیں تھی۔ جن احادیث سے سماع موٹی ثابت ہوتا ہے

۱۔ کیا سماع موٹی کے قائل مشرک ہیں؟

میں نے سماع موٹی کے قائلین کو کسی جگہ بھی مشرک نہیں کہا۔ یہ مولانا محمد علی صاحب کا اپنا خیال ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں یہ لکھا تھا کہ حضرت عبداللہ بن عمر سماع موٹی کے قائل تھے۔ چنانچہ ایک مستغفر شاہ فاروق ہاشمی صاحب نے پوچھا تھا کہ سماع موٹی کے قائلین کے حق میں آپ کیا فتوے دیتے ہیں؟ تو میں نے اس کے جواب میں لکھا تھا کہ ”میں کوئی فتویٰ دینے کے حق میں نہیں ہوں، البتہ آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ آپ اس سلسلہ میں تشدد نہ ہوں“ (محدث رمضان ۱۴۰۲ھ ص ۳۱)

— رہی یہ بات کہ یہ شرک کا سب سے بڑا چور دروازہ کیسے ہے؟ تو اگر تو بات صرف سماع موٹی تک محدود رہتی تو اس میں حرج بھی نہ تھا۔ مگر جب بات یوں بڑھے کہ مردے علی الاطلاق سلتے ہیں اور ہر آنے والے کی ہر وقت سنتے ہیں۔ پھر صرف سنتے ہی نہیں، جواب بھی دیتے ہیں۔ حاجت روائی اور مشکل کشائی بھی کرتے ہیں۔ پھر صرف قبر پر ہی نہیں بلکہ ہر جگہ سے سن سکتے ہیں۔ تو بتلائیے کہ اور شرک کسے کہتے ہیں؟ نداء بغیر اللہ اور کیا چیز ہے؟ جس کی قرآن پر زور تردید کرتا ہے جبکہ یہ بھی مسلم ہے کہ اللہ کے سوا جتنے بھی معبود ہیں سب باطل ہیں۔

۱۵۔ یہ بحث ذرا تفصیل سے آگے چل کر آئے گی۔

وہ تیسرے اور چوتھے درجہ کی ہیں، جو قابل احتجاج نہیں ہوتیں۔ جو توں کی چاپ سننے والی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ میت کو احساس دلایا جاتا ہے کہ جن عزیز و اقارب کی وجہ سے تو مارا مارا پھرتا تھا وہ تجھے تنہا چھوڑ کر جا رہے ہیں، اس کے علاوہ اسے کچھ سنائی نہیں دیتا۔

یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”اللہ میری روح کو لوٹاتا ہے، حتیٰ کہ میں اس سلام کا جواب دیتا ہوں جو مسلمان مجھ پر سلام بھیجتا ہے“ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر مبارک میں زندہ نہیں جیسا کہ عام مسلمانوں کا عقیدہ ہے، اگر زندہ ہوں تو رُوح کے لوٹانے جانے کا کچھ مطلب نہیں نکلتا۔

قرآن مجید سماع کی پر زور تردید کرتا ہے۔ ضعیف، وضعی احادیث سماع موٹی کا جواز مہیا کرتی ہیں۔ اماموں اور بزرگوں کی روایات سب خرافات ہیں۔ انہیں ماننا گویا قرآن و سنت سے دستبردار ہونا ہے۔

مولانا کیلانی صاحب نے اکابر مفسرین پر اعتماد کرنے کی بجائے من مانے نتائج اخذ کیے ہیں اور اگر اعتماد کیا ہے تو مولانا مودودی صاحب پر گویا کیلانی صاحب نے جو تشریحات کی ہیں اور مولانا مودودی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے قرآن و سنت کا منشا بھی یہی ہے۔

مولانا مودودی نے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ میں نے دین کو ماضی حال کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے ہمیشہ قرآن و سنت سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اس لیے کبھی یہ معلوم کرنے کے لیے کہ خدا کا دین مجھ سے اور ہر مومن سے کیا چاہتا ہے یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ فلاں اور فلاں بزرگ کیا کہتے اور کرتے ہیں۔ (رد وادب ممتاح) کیلانی صاحب نے اس مفہوم کو یوں ادا کیا ہے کہ ”اللہ کا شکر ہے کہ اہل حدیث نہ کسی امام کا مقلد ہے نہ علامہ کا، وہ ان بزرگوں سے استفادہ تو کر سکتا ہے مگر روشنی براہ راست قرآن و سنت سے حاصل کرتا ہے۔“

الزام یہ نہیں کہ مولانا مودودی صاحب قرآن و سنت کو دین کا ماخذ قبول سمجھتے تھے اور کیلانی صاحب قبول سمجھتے ہیں؛ بلکہ اعتراض یہ ہے کہ ماضی کے اشخاص اور

بزرگوں میں صحابہ کرام سے تابعین، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین، مفسرین و محدثین سب آجاتے ہیں۔ بقول علامہ ارشد القادری، (مصلحت زلزله) (یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی مشترک اور متواتر کوششوں سے دین اپنی واضح اور مفصل تشریحات کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے۔ لیکن نہ مولانا مودودی صاحب کو ان بزرگوں کی فکر و دیانت پر اعتماد تھا اور نہ کیلانی صاحب کو ہے، یہ سب کی راستے ٹھکرا کر اپنی برتری منوانا چاہتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ قرآن و سنت ہی دین کا اصل ماخذ ہے، لیکن بحث الفاظ و عبارات میں نہیں، ان کے مفہوم و معانی میں ہے لگے اور ظاہر ہے کہ مفہوم کے تعین میں فہم

۱۱۔ بزرگوں کی مشترک اور متواتر کوششیں؟

اب دیکھیے ان بزرگوں کی مشترک اور متواتر کوششوں سے ہی دین شیعہ حضرات کو بھی پہنچا ہے۔ بریلویوں، قادیانیوں، اہلحدیثوں کو بھی۔ غرضیکہ سب حضرات دین کی تعلیم کے بارے میں اپنے ڈانڈے سے انہی بزرگوں کے واسطے سے تابعین اور صحابہ تک پہنچاتے ہیں تو کیا یہ سارے کے سارے فرقتے حق پر ہیں؟ آخر کون سی دلیل سے آپ اپنے علاوہ دوسروں کے بزرگوں کے فہم کو رد کر سکتے ہیں؟

۱۔ قرآن سماع موتی کی پُر زور تردید کرتا ہے۔

۲۔ پھر قرآن ہی سے اللہ تعالیٰ کے، مُردوں کو سننے کی استثنائی صورت بھی ثابت ہوتی ہے جس کی تائید بعض احادیث صحیحہ بھی کرتی ہیں۔

۳۔ موضوع احادیث یا تیسرے اور چوتھے درجہ کی احادیث سماعِ موتی کا

علی الاطلاق جواز ثابت کرتی ہیں۔

۴۔ بعض بزرگوں کے اقوال صرف سماعِ موتی تو درکنار، ان مُردوں کے جواب دینے اور حاجت روائی اور مشکل کشائی یا تصرف فی الامور کی بھی پُر زور تائید کرتے ہیں جو قرآن کی تعلیم کے صریح خلاف ہیں۔

پھر مجھے قطعاً یہ اصرار نہیں کہ دوسرے لوگ میرے فہم کو قابلِ اعتماد سمجھیں بلکہ ان کے لیے بھی یہی راہِ صواب ہے کہ وہ ہر بات کو کتاب و سنت پر پیش کرنے کے بعد کسی بات کو درست یا نادرست قرار دیں۔

ہی کو دخل ہے۔ اور جب اکابر امت کا فہم مولانا مودودی صاحب کے نزدیک قابل اعتبار نہیں تھا اور جناب کیلانی صاحب کے نزدیک نہیں ہے تو خود ان کے فہم پر کوئی کیسے اعتماد کر سکتا ہے؟

قیامت کی نشانیوں میں ایک نشانی یہ بھی آئی ہے،
 ”اس امت کے پھلے اگلوں پر لعن طعن کریں گے“ (ترمذی جلد دوم)

ہے پھیلوں کا پہلوں پر لعن طعن۔

لعن طعن کرنا اور بات ہے۔ ان کی عزت و تعظیم کرنا اور بات، اور ان کے اقوال و ارشادات کو قابل اتباع اور حجت سمجھنا اور بات ہے۔ لعن طعن کرنے والے تو شیعہ حضرات ہیں جو علی الاعلان صحابہ کرام پر تبرک بولتے ہیں۔ یا پھر خارجی، ناموسی، رافضی وغیرہ ہیں۔ جو علی الاعلان لعن طعن نہ بھی کریں، تاہم ان کے منہ سے ان بزرگوں کے حق میں کلمہ خیر کم ہی نکلتا ہے۔ ان کے علاوہ مسلمانوں کے جتنے فرقے ہیں میرے خیال میں ان میں سے کوئی بھی بزرگوں پر لعن طعن نہیں کرتا۔ صحابہ کرام اور تابعین تو درکنار، ہم تو انہی کرام کو قابل تعظیم اور ان کی کوششوں کو مستحسن سمجھتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان میں سے ہر ایک کی ہر ایک بات کو ہم من و عن تسلیم کر لیں جبکہ ہمارے پاس ایک معیار موجود ہے کہ دین کی ہر ایک بات کو کتاب و سنت پر پیش کیا جانا چاہیے۔ اب اگر کسی بزرگ کی بات اس معیار پر پوری نہ اترنے کی وجہ سے ناقابل قبول سمجھی جاتے تو اس سے لعن طعن کا کوئی نسا پہلو نکلتا ہے؟ اس بات کو میں ایک مثال سے سمجھاؤں گا۔

امام نسائی نے اپنی سنن (کتاب الحج) میں مروان بن حکم سے روایت کی، کہ میں حضرت عثمان مہکمہ کے پاس بیٹھا تھا انہوں نے حضرت علیؑ کو عمرہ اور حج دونوں (یعنی حج قرآن) کی لیبک کہتے ہوئے سنا تو حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؑ کو اس سے منع فرمایا اس پر حضرت علیؑ نے جواب دیا کہ:

”فَلَنْ أَدْعَى قَوْلَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ“

(نسائی، کتاب الحج، باب القرآن)

”میں تمہارے قول کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ ”بڑی جماعت کی پیروی کرو“ یعنی جس طرف

قول کو نہیں چھوڑ سکتا۔

غور فرمائیے۔ حضرت عثمانؓ اپنے دور خلافت میں حضرت علیؓ کو حکماً اس بات سے منع کرتے ہیں۔ (جس کی وجہ یہ تھی کہ آپؐ کو پہلے اس کا علم نہ تھا) لیکن حضرت علیؓ نے آپؐ کے قول کی کوئی پروا دینے کی تو پھر دوسرے ائمہ کرام یا بزرگان دین کس شمار و قطار میں ہیں؟

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے والد محترم سے حج تمتع کے بارے میں اختلاف کیا۔ اور حضرت عمر فاروقؓ سے کہا کہ ”میں تو آپؐ کو رسول اللہ کا قول سنا تا ہوں اور آپ اپنی بات کرتے ہیں“ بغرضیکہ ایسی مثالیں دور صحابہؓ میں کافی مل جاتی ہیں۔ اب ہم نہیں سمجھتے کہ حضرت علیؓ کا حضرت عثمانؓ کو اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا حضرت عمرؓ کو یہ جواب لعن لعن کیسے کہلا سکتا ہے؟

ائمہ و مشائخ کے اقوال کو حجت سمجھنا انہیں رب بنانے کے مترادف ہے۔

اب ان ائمہ کرام اور بزرگان دین کی مشترک اور متواتر کوششوں کا دوسرا پہلو بھی سامنے لائیے۔ ان حضرات کی ہر بات کو قابل اتباع سمجھنے کا دوسرا نام تقلیدِ آباء یا آباء پرستی ہے۔ جسے قرآن کریم نے بہت سے مقامات پر مردود قرار دیا ہے۔ یہود و نصاریٰ کے یہی ائمہ کرام اور بزرگان دین تھے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”إِن تَخَذُوا آخْبَارَهُمْ وَرُءُوبَانَهُمْ أَزْيَابًا وَمِن دُونِ اللَّهِ“

”انہوں نے علماء اور مشائخ کو اللہ تعالیٰ کے سوا رب بنا لیا تھا“

اس آیت سے متعلق جب عدلیؒ بن حاتم۔ جو پہلے عیسائی تھے۔ نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ ”یا رسول اللہ! ہم اپنے علماء و مشائخ کو رب تو نہیں سمجھتے تھے“ تو رسول اللہؐ نے جواب دیا۔ ”کیا تم ان کے بتلاتے ہوئے حلال کو حلال، اور حرام کو حرام نہیں سمجھتے تھے؟“ عدلیؒ بن حاتم نے جواب دیا۔ ”ہاں یہ بات تو تھی“ تو آپؐ نے فرمایا، ”رب بنانے کا یہی مطلب ہے“ (ترمذی، ابواب التفسیر، سورۃ توبہ)

اکثر علماء ہوں!۔ جبکہ کیلانی صاحبہ پھلوں کی تھریوں کو مردود ٹھہرا کر صحیح

گویا یہود و نصاریٰ کی اصل غلطی یہ تھی کہ وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ یہ بزرگان دین اور ائمہ کرام شریعت کو ہم سے بہتر سمجھتے اور ہم سے بہت زیادہ نیک اور متقی تھے لہذا وہ دین کی باتوں کو شریعت کے اصل ماخذ پر پیش کرنے کی بجائے انہی بزرگوں اور ائمہ کرام کے اقوال و اشادات کو قابل اتباع سمجھ لیتے تھے اور کہتے تھے کہ دین ہمیں انہی بزرگان دین کی مشترک اور متواتر کوششوں سے پہنچا ہے۔

فرقہ پرستی کی اصل بنیاد۔

اور تیسری قابل غور بات یہ ہے کہ دین میں جب کبھی بھی بگاڑ پیدا ہوا ہے تو انہی ائمہ کرام اور مشائخ عظام کے اقوال و ارشادات کو حجت اور واجب اتباع سمجھنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ کیونکہ یہی بات فرقہ پرستی کی بنیاد بنتی ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے

وَهَلْ أَسْأَلُ الدِّينَ إِلَّا الْمَلُوكَ وَأَحْبَارَ سُوءِ زُرْهَبَانِهَا

یعنی "دین کو تباہ و برباد کرنے والے تین ہی گروہ ہو سکتے ہیں۔ بادشاہ،

علماء سوہ اور بزرگان دین"

اسی لیے امام مالکؒ رسول اللہؐ کی قبر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کرتے تھے:

"صرف یہی وہ دستی ہے جس کی کسی بھی بات کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ باقی رہے دوسرے لوگ، تو ان کی باتوں کو قبول بھی کیا جاسکتا ہے اور رد بھی۔

اور امام بخاریؒ نے تو "کتاب الاعتصام بالسنة" میں ایک مستقل باب باندھا ہے جس کا عنوان ہے:

"آنحضرتؐ کے سامنے ایک بات کی جائے اور آپ اس پر انکار

نہ کریں تو یہ حجت ہے۔ آپ کے سوا کسی اور کی تعزیر حجت نہیں"

یعنی بڑی جماعت یا سوواد اعظم کا مفہوم؟

"بڑی جماعت یا سوواد اعظم سے موصوف نے "اکثر علماء" مراد لی ہے۔ اگر ان کا یہ مفہوم درست سمجھا جائے تو یہ بات بھی کوئی پسندیدہ چیز نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

تشریحات کو اپنی اور اپنے چند ہم خیالوں کی تحریروں میں مقتد سمجھے ہوتے ہیں۔

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَنْ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَابِ وَالرَّهْبَانِ
لِيَآكُلُوا أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ
اللَّهِ“ (التوبة: ۳۴)

”اے ایمان والو! علماء اور مشائخ کی اکثریت ایسی ہے جو ناسحق لوگوں
کے مال کھاتے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں“

گویا علماء و مشائخ کی اکثریت خدائی احکام کی غلط تعبیر پیش کر کے ایک تو لوگوں
سے پیسے بطور قریبے اور دوسرے شریعت کی راہ میں روک بن جاتی ہے۔ اور رہبان
یعنی مشائخ عظام یا بزرگان دین کے متعلق بھی بالوضاحت فرمایا کہ،
”وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ“ (المائدہ: ۲۷)

”ان میں سے اکثر فاسق ہوتے ہیں“

ان آیات کی روشنی میں محض علماء کی اکثریت کو کیسے واجب الاتباع قرار دیا جا
سکتا ہے۔؟

بڑی جماعت سے حقیقتاً وہ جماعت مراد ہے جو نظام خلافت قائم کرتی یا رکھتی ہے۔ آپ کے
ایسے ارشادات کا تعلق سیاسی امور سے ہے۔ جیسا کہ آپ نے فرمایا:-

لَا إِسْلَامَ إِلَّا بِالْجَمَاعَةِ، وَلَا
جَمَاعَةَ إِلَّا بِالْإِمَامِ، وَلَا إِمَامَ
إِلَّا بِالتَّمَجُّعِ وَالطَّاعَةِ۔
اسلام جماعت کا متقاضی ہے اور جماعت
امیر کی اور امیر کی امارت تب ہی ممکن ہو سکتی ہے
کہ اس کی بات سنی اور اس کی اطاعت کی جائے۔

اس بات کی مزید وضاحت درج ذیل احادیث سے بھی ہوتی ہے:-

”حضرت عرفجہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ: اگر تمہارے معاملات
کسی ایک شخص پر مجتمع ہوں۔ پھر کوئی دوسرا شخص تمہاری قوت کو توڑے یا تقریر ڈالے تو اسے
قتل کر دو۔“ (مسلم - کتاب الامارہ والقضاء)۔

”حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: جو کوئی امیر کی اطاعت سے نکلا اور
جماعت سے الگ ہوا پھر مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔“ (مسلم - حوالہ ایضاً)۔

آخر ایسا مسئلہ جس پر اکابر علماء امت کا اجتماع ہو چکا ہوگی مخالفت کرنا کونسی دینی خدمت ہے؟ جبکہ سماع موتی کے باب میں اکابر علماء نے بھی قرآن و سنت ہی سے استدلال کیا ہو۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:
 ”باجملہ کتاب و سنت مملو و مشحون اند کہ دلالت می کند بر وجود علم موتی را بدینا و اہل دنیا پس منکر نشود آں را جاہل باخبار و منکر دین“
 (اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ جلد سوم ص ۱۱۸)

ترجمہ: ”مختصر یہ کہ کتاب و سنت ایسے دلائل سے بھر پور ہیں جو اموات میں دنیا و اہل دنیا کے علم و معرفت اور احساس و شعور پر دلالت کرتے ہیں۔ لہذا سماع اموات کا منکر صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو اخبار و روایات سے بے خبر ہو یا پھر ضروریات دین کا منکر!“

کے سماع موتی پر اجماع اہمیت؟

سماع موتی کے مسئلہ پر اجماع تو صحابہ میں بھی ثابت نہیں کیا جاسکتا تو پھر آپ کون سے اکابر علماء امت کے اجماع کی بات کرتے ہیں؟ علاوہ ازیں ہم پہلے مرعاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۵، کے سوال سے بتلا چکے ہیں کہ صرف ایک عبد اللہ بن عمرؓ سماع موتی کو درست سمجھ کر رسول اللہؐ کی قبر مبارک پر آکر سلام جتے تھے۔ دوسرے کسی صحابی سے یہ عمل ثابت نہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور سیران پیر کی نماز۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہی وہ محدث ہیں جنہوں نے سماع موتی کو بنیاد بنا کر ”صلوٰۃ غوثیہ“ پاپیرین پیر کی نماز تک کو جائز اور درست تسلیم کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: ”آپ (سید عبد القادر جیلانی) نے فرمایا کہ جو شخص دو رکعت نماز پڑھے۔ ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد گیارہ مرتبہ سورہ اخلاص پڑھے اور سلام کے بعد سرکار پر درود بھیجے اور میرا نام لے کر اللہ سے دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے حاجت بری کرے گا۔ (ایک روایت میں ہے کہ گیارہ قدم عراق کی جانب چل کر میرا نام لے کر دعا مانگے، لیکن یہ روایت ثابت نہیں ہے)۔“ (اخبار الاخیار مصلفہ عبدالحق محدث

حضرت سراج الہند مولانا شاہ عبد الغزیز ابن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”بالجملہ انکار شعور و ادراک اموات اگر کفر نباشد در الحاد بولدن اوشبہ نیست“
 ترجمہ: ”مختصر یہ کہ اگر اموات کے احساس و شعور کا انکار کفر نہ ہو مگر منکر کے الحاد و بے دینی میں شبہ نہیں ہے۔“

دہلوی مترجم اردو سبحان محمود ص ۱۲۹، ۱۵۰، نیز دیکھیے، سیرۃ سؤت الثقلین مصنفہ ضیاء اللہ قادری ص ۲۴۲

غور فرمائیے، محدث صاحب کے اس پورے بیان میں صرف آخری ایک طعنت ثابت نہیں، باقی سب ٹھہرا شک و شبہ تحقیق شدہ ہے۔ اور یہ بات ہے بھی قرین قیاس کہ جہاں ہزاروں میل کا فاصلہ ہو، وہاں صرف گیارہ قدم جانب عراق (بلند جو شیخ جیلانی کا مولد و مدفن ہے) چلنے یا نہ چلنے سے بھی کیا فرق پڑتا ہے؟ پھر عراق کی بات (رُخ) تلاش کرنے سے بھی اس روایت کی بے ثبوتی نے آزاد کر دیا۔

اب ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”إِنَّا كُنَّا نَعْبُدُ وَإِنَّا كُنَّا نَسْتَعِينُ“ (الفاتحہ: ۴)

(اے اللہ!) ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔“

اور دوسری طرف عبد الحق محدث صاحب کا یہ تحقیق شدہ بیان ہے۔ ان میں مناسبت و موافقت آپ خود ملاحظہ فرمائیے۔ محدث صاحب نے جن بلند باتیں مزاج سے تحقیق فرمائی ہیں، وہ یہ ہیں:

بہتہ الاسرار قلائد الجواهر، زبدۃ الآثار، زہدۃ الخاطر للفاتر اور تفریح الخاطر۔

دیکھیے ان میں کوئی بھی حدیث کی کتاب ہے؟ — یہ ہے، اکثر علماء کے اقوال

کو واجباً للتابع سمجھنے کا نتیجہ!

۱۵ اموات کا احساس و شعور۔

اموات کے احساس و شعور سے کسے انکار ہے؛ اگر ان میں احساس و شعور نہ ہو

تو قبر کا عذاب کیسے ہو سکتا ہے اور اموات جنت کے فوائد سے کیسے مستفید ہو سکتے ہیں؟ لیکن اس احساس و شعور سے یہ کب لازم آتا ہے کہ وہ اہل دنیا کی باتیں بھی سن سکتے ہیں؟

مولانا عبدالرحمن کیلانی صاحب کے قرآن مجید سے انکارِ سماع سے

متعلق دلائل اور ان کا تجزیہ

دلیل نمبر ۱: والذین یدعون ترجمہ - "اور جنہیں خدا کے سوا یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کچھ پیدا نہیں کر سکتے۔ بلکہ وہ تو خود پیدا شدہ ہیں وہ لاشیں ہیں لے جان۔"

کیلانی صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اموات غیر احیاء کا اطلاق نہ جنوں پر ہو سکتا ہے نہ فرشتوں پر باقی صرف فوت شدہ بزرگ رہ جاتے ہیں جن پر اس آیت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

کیلانی صاحب کا اخذ کردہ یہ نتیجہ چند وجوہ کی بنا پر باطل ہے۔ فوت شدہ بزرگوں میں انبیاء کرام، صدیقین، شہداء، صالحین بھی داخل ہیں۔ انبیاء کرام کی حیات قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَأَسْأَلُ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مَنْ رَسَلْنَا أَنْ جَعَلْنَاهُمْ
دُونَ الرَّحْمَنِ يَعْبُدُونِ۔

ترجمہ۔ وہ رسول و نبی جو ہم نے آپ سے پہلے مبعوث فرمائے ان سے پوچھو

عَنْ مَنْ دُونِ الرَّحْمَنِ أَلِهُمَّةٌ . . . (ادوارہ)

اسی عالم دنیا میں ایک سوا ہوا شخص پاس بیٹھے ہوئے آدمیوں کی گفتگو نہیں سن سکتا، تو دوسرے عالم یعنی عالم برزخ میں پہنچا ہوا شخص اس عالم دنیا کی باتیں کیونکر سن سکتا ہے؟ بیاں ہمہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سوا ہوا شخص احساس و شعور رکھتا ہے۔ اور اسی احساس و شعور کی وجہ سے خواب میں چلتا پھرتا، باتیں کرتا اور سنتا ہے۔

۱۲۔ قرآنی دلیل کا جواب

یہاں لفظ "وَأَسْأَلُ" کا ترجمہ بعض مترجمین نے "پوچھو" کے بجائے "احوال دریافت کرو" بھی کیا ہے (مثلاً فتح الحمید ترجمہ فتح محمد خالد صری) تاہم حاشیہ میں اکثر مفسرین نے وضاحت کر دی ہے کہ اس سے مراد ان رسولوں کی کتابوں کی طرف رجوع کرنا ہے مثلاً:

لیجئے کہ ہم نے ذاتِ رحمن جل وعلیٰ کے بغیر کوئی معبود مقرر کیے ہیں جن کی عبادت کی جائے یقیناً ایسا نہیں۔

۱- ترجمہ شاہ رفیع الدین حاشیہ موضع القرآن (شاہ عبدالقادر) ہفت یعنی ان رسولوں پر جو کتابیں اتری تھیں ان کو دیکھ لے یا ان کی امت کے لوگوں سے پوچھ لے؛
 ۲- موضع القرآن از وحید الزمان نے بھی حاشیہ پر بالکل یہی الفاظ نقل کیے ہیں۔
 ۳- تفہیم القرآن: شاہ رسولوں سے پوچھنے کا مطلب ان کی لائی ہوئی کتابوں سے معلوم کرنا ہے۔ جس طرح "فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی معاملہ میں اگر تمہارے درمیان نزاع ہو تو اسے اللہ اور رسول کے پاس لے جاؤ، بلکہ یہ ہے کہ اس میں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی طرف رجوع کرو۔ اسی طرح رسولوں سے پوچھنے کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ جو رسول دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں، ان سب کے پاس جا کر دریافت کرو۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ خدا کے رسول دنیا میں جو تعلیمات بھڑکتے ہیں ان سب میں تلاش کر کے دیکھ لو، آخر کس نے یہ بات انہیں سکھادی کہ اللہ جل شانہ کے سوا بھی کوئی عبادت کا مستحق ہے؟

۴- ترجمہ رضا خاں بریلوی (کنز الایمان) اور حاشیہ نعیم الدین مراد آبادی علیہ السلام سے سوال کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ان کے اُدیان وطل کی تلاش کرو۔ کہیں بھی کسی نبی کی امت میں بُت پرستی روارھی گئی ہے؛ اور اکثر مغتربین نے اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ مومنین اہل کتاب سے دریافت کرو۔ کیا کسی نبی نے غیر اللہ کی عبادت کی اجازت دی؛ تاکہ مشرکین پر ثبات ہو جائے کہ مخلوق پرستی نہ کسی رسول نے بتائی نہ کسی کتاب میں آئی۔ یہ بھی ایک روایت ہے کہ شبِ معراج سید عالم نے بیت المقدس میں تمام انبیاء کی امامت فرمائی۔ جب حضور نماز سے فارغ ہوئے جبریل نے عرض کیا کہ لے سرورِ اکرمؐ، اپنے سے پہلے انبیاء سے دریافت فرما لیجئے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے اپنے سوا کسی اور کی عبادت کی اجازت دی؛ حضورؐ نے فرمایا کہ اس سوال کی کچھ حاجت نہیں۔ یعنی اس میں کوئی شک ہی

اگر انبیاء کرام میں حیا نہ ہوتی، وہ خطاب و ندا کو نہ سمجھتے ہوتے اور جواب

نہیں کہ تمام انبیاء۔ توحید کی دعوت دیتے آئے۔ سب نے مخلوق پرستی کی ممانعت فرمائی“

اب دیکھیے ہم نے چار مختلف مکاتب فکر کے مفسرین کے حواشی پیش کر دیے ہیں۔ اور چاروں نے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ یہاں ”وَاشْتَقَل“ سے مراد ان کی کتابوں سے یا تو منہیں اہل کتاب سے معلوم کرنا ہے۔ نہ کہ گزشتہ رسولوں سے دریافت فرمانا۔ اور پانچویں فتح محمد جالندھری بھی ہیں۔ جنہوں نے ترجمہ میں ہی مسئلہ حل کر دیا۔ البتہ کثر الایمان کے مفسر نعیم الدین صاحب مراد آبادی نے ایک روایت بھی درج فرمائی۔ اور یہی روایت جناب محمد علی صاحب مضمون کو بھی پسند آئی ہے۔ چنانچہ آپ نے اس مضمون میں یہ روایت تفسیر کھیرچ، ص ۴۳ کے حوالہ سے درج فرمائی ہے۔ لیکن یہ روایت غلط معلوم ہوتی ہے وجہ یہ ہے کہ سورۃ زخرف کی یہ آیت واقعہ معراج سے کافی عرصہ بعد نازل ہوئی ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل، جس میں مسجد اقصیٰ کے واقعہ کا ذکر ہے، کا ترتیب نزول کے حساب سے نمبر ۵ ہے۔ جبکہ سورۃ زخرف کا ترتیب نزول کے حساب سے نمبر ۶۳ ہے۔ معراج کا واقعہ ہجرت سے دو سال قبل کا ہے۔ جبکہ سورۃ زخرف اس وقت نازل ہوئی جبکہ کفار آپ کی جان کے درپے تھے۔ جیسا کہ اس سورہ کی آیت نمبر ۷۹، ۸۰ سے واضح ہے۔ لہذا قبل از نزول آیت مذکورہ، جبریل کا حضور سے یہ کہنا کہ ان رسولوں سے پوچھ لیجئے اور پوری آیت پڑھ جانا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟

وضعی روایت اور سماع موتی۔

پھر اگر اس روایت کو درست بھی تصور کر لیا جائے تو بھی اس پر درج

ذیل اشکال وارد ہوتے ہیں۔

۱۔ مسجد اقصیٰ میں سو لاکھ پیغمبروں کے (برزخی زندگی میں جمع ہونے کے علاوہ اس سے قبل، تمام بنی نوع انسان کی ارواح کو اللہ تعالیٰ نے اس وقت بھی

کی قدرت ان میں نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء و رسل سے دریافت کرنے کا حکم نہ فرماتا۔

کنز العمال میں حدیث ہے۔ من صلی علی عند قبری سمعتہ
ومن صلی علی من بعید علمتہ (ابو شیخ عن ابی ہریرۃ)
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ
وسلم نے فرمایا جس شخص نے میری قبر کے پاس درود پڑھا میں خود ستا ہوں اور جس شخص
نے مجھ پر دُور سے درود پڑھا میں اس کو جانتا ہوں۔

حدیث ۲: عن ابی ہریرۃ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حاضر کیا تھا جب ان سے عہد "المست" لیا تھا۔ اور اس دور کو خدا تعالیٰ
نے موت کا دور کہا ہے تو پھر تو سماع موتی کے قائلین کو اس معراج والے
سوال جواب کے بجائے اس واقعہ سے ثبوت پیش کرنے کا زیادہ فائدہ ہے کیونکہ
اس موت کے دور میں روحوں نے صرف سنا ہی نہیں تھا بلکہ جواب بھی دیا تھا۔
۲۔ جبریلؑ نے حضور اکرمؐ سے کہا بھی کہ انبیاء حاضر ہیں۔ ان سے سوال
لیجئے۔ لیکن آپؐ نے پھر بھی سوال نہیں کیا تو اس آیت پر عمل کیا ہوا؟

۳۔ پھر جب آپؐ نے سوال ہی نہیں کیا، نہ ہی انبیاءؑ کی ارواح نے مجھ جواب
دیا تو سماع موتی ثابت کیسے ہوا؟ اور اس روایت سے آپؐ کا استدلال درست کیونکر؟
ان تصریحات سے البتہ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "وَأَسْتَشَلُّ" کا حکم
وجوب کے لیے نہیں بلکہ اختیاری ہے۔ یعنی اگر آپؐ چاہیں تو سابقہ انبیاءؑ کی
کتاب یا ان یہود و نصاریٰ کے مومنین یا بصدیق روایت بالآ انبیاءؑ کی ارواح سے
پوچھ سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ آپؐ کو یقین تھا کہ ایسی بات کا کسی الہامی کتاب میں
لکھا ہونا ناممکن ہے۔ لہذا آپؐ نے کسی سے بھی کچھ نہ پوچھا اور نہ ہی سماع موتی
کے استنباط کی گنجائش باقی رہی۔

۴۔ دوسری وضعی روایت۔

اس موضوع حدیث پر پہلے ص ۵۳ پر بحث گزر چکی ہے۔

ما من احد یسلم علی الاعلیٰ روحی اورد علیہ رواۃ الطبرانی فی الاوسط
 "رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا کوئی شخص ایسا نہیں جو مجھ پر سلام پڑھے مگر اللہ تعالیٰ
 مجھ پر رُوح کو لوٹاتا ہے تاکہ میں اس کا جواب دوں" اور کوئی وقت ایسا نہیں
 جب آپ پر درود و سلام نہ پڑھا جائے۔ آپ ہر وقت صلوة و سلام کا جواب
 روح بمعہ جسم ہی عطا فرماتے ہیں۔

اب کیلانی صاحب ہی بتائیں کہ ان بزرگ ہستیوں انبیاء کرام کو ایک مسلمان
 کیسے بے جان لاشیں تصور کرے۔ شہداء سے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ولا تقولوا
 لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احياء وکن لا تشعرون۔
 جو لوگ اللہ تبارک تعالیٰ کے راستہ میں قتل کیے گئے انہیں مردہ نہ کہو بلکہ
 وہ زندہ ہیں لیکن ہمیں ان کی زندگی کا شعور نہیں۔ اس آیت سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے
 بزرگوں کی لاشیں بے جان نہیں۔ کیلانی صاحب حقیقت یہی ہے کہ سورۃ نحل کی

عہ چوہدری صاحب نے اپنے مضمون میں عربی عبارات کتفلط لکھی ہیں۔ پھر اعراب کے بغیر
 بھی ہیں جبکہ ادو عبارت میں اکثر پنکچویشن کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ ادارہ محدث اگرچہ اعراب
 صحیح لفظی وغیرہ کا خصوصی التزام کرتا ہے لیکن ہم نے چوہدری صاحب کی عبارات کو نہ
 درست کیا ہے نہ ان پر اعراب وغیرہ لگائے ہیں۔ مقصد یہی ہے کہ ان کا مضمون من و عن
 شائع ہو ورنہ قارئین ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ اس حدیث کی عبارت کو انہوں نے مضحکہ خیز رنگ
 بگاڑ دیا ہے۔ حالانکہ کیلانی صاحب کے جس مضمون پر فقہ تعاقب کر رہے ہیں، اسی مضمون سے اس کی
 صحیح عبارت نقل کی جا سکتی تھی، جو یوں ہے: "ما من احد یسلم علیٰ رآلہ رآلہ اللہ وعلیٰ
 روحی حتیٰ اُرَدَّ عَلَیْہِ السَّلَامُ" (محدث جلد ۲، اعداد ۲-۳ ص ۲۴)
 یہ وضاحت ایسے کر دی ہے کہ قارئین کرام مدیم صحیح عبارت کو ادارہ کا تامل نہ سمجھیں۔ (ادارہ)

۳۱ تیسری وضعی روایت۔

طبرانی کی اس حدیث پر بھی ص ۵۲ پر بحث گزر چکی ہے۔

۱۳ شہداء کی زندگی ہمارے جیسی نہیں۔ اگر ہمارے جیسی ہوتی تو ہم
 اسے ضرور سمجھ سکتے۔ اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ قبروں میں پڑے ہوئے بزرگ زندہ ہیں
 ہماری بات سنتے، جواب دیتے اور ہماری بگڑی بنا سکتے ہیں تو ایسی زندگی کو ہم
 سمجھ سکتے ہیں اور یہ بات نص قرآنی سے خلاف ہے، نیز دیکھئے ص ۱۳۱ اور کتاب ہذا۔

یہ آیت مبارکہ کفار کے معبودانِ باطل توں وغیرہ کے حق میں نازل شدہ ہے۔
 دلیل - ۲- ترجمہ - زندہ اور مردے برابر نہیں ہو سکتے اللہ جس کو چاہے سنا
 سکتا ہے لیکن (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں
 میں مدفون ہیں۔ - حافظ ۲۲

اس آیت سے استدلال بھی درست نہیں کیونکہ اس آیت کا حاصل
 یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے۔ اللہ سنا
 سکتا ہے۔

دلیل نمبر - ۳- ترجمہ - اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو گا جو ایسے
 کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہ دے سکے بلکہ ان کو ان لوگوں کے
 پکارنے کی خبر بھی نہ ہو۔ پھر جب لوگ مدوز قیامت) اکٹھے کیے جائیں گے۔
 تو وہی پکارے گئے لوگ ان پکارنے والوں کے دشمن بن جائیں گے اور ان کی
 پرستش سے انکار کر دیں گے (الاحقاف ۶۵)

کیلائی صاحب کی تشریح - آیت نمبر میں وَهُوَ عَنِ دُعَاؤِهِمْ
 غَفْلُونَ کے الفاظ جنوں اور فرشتوں کو معبودانِ باطل کے زمرہ سے خارج کر دیتے
 ہیں کیونکہ وہ دعائیں سن سکتے ہیں اور گائوا کہہ کر اعداء کے الفاظ توں
 اور مظاہر قدرت کو معبودانِ باطل کے زمرہ سے خارج کر دیتے ہیں ... اب
 صرف فوت شدہ بزرگ ہی رہ جاتے ہیں جو اس آیت کا صحیح مصداق بن
 سکتے ہیں۔

مولانا کیلائی صاحب کا یہ استدلال بھی غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ بزرگوں کے

ساتھ بغض و عناد سے محفوظ رکھے۔

۱۲ بزرگوں سے بغض و عناد؟ - بزرگوں سے بغض و عناد سے مراد اگر فوت شدہ

بزرگوں کو زندہ تسلیم نہ کرنا، اور تصرف فی الامور یا الوصیت میں انہیں خدا کا شریک و شریک
 سمجھنا ہے تو ہم واقعی اپنے اس "جہم" کا اقرار کرتے ہیں۔ تاہم ایک بات پوچھنے کا حق ضرور
 رکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ آخر خود رسول اللہ کو ان بزرگوں سے کیا بغض و عناد تھا، جن کے
 مقبرے، مدفن اور مزارات کو آپ نے حضرت علیؓ کو بھیج کر حکماً مہسار کر دیا تھا، کیا ان
 کی دوجیسی نہ تھی کہ وہ لوگ ایسے ہی عقائد میں مبتلا تھے؟

مولانا موصوف کے اس استدلال کا بطلان و فساد قرآن حکیم سے واضح کیا جائے گا۔
پہلے اس بارے میں اقوالِ مفسرین پیش کیے جائے ہیں۔

امام ابن کثیر فرماتے ہیں ای لا اصل ممن يدعو من دون
الله اصناما و يطلب منها ما لا تستطيع الی يوم
القيامة و هي غافلة عما يقولون لا تسمع ولا تبصر
ولا تبطش لا نها جواد حجارة صم۔ جلد ۴ ص ۱۵۴

ترجمہ۔ یعنی کوئی اس شخص سے زیادہ گمراہ نہیں جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ بتوں کی
عبادت کرتا ہے اور ان سے ایسے امور کی استدعا کرتا ہے جن کی قیامت تک
ان میں استطاعت و قدرت نہیں اور وہ ان کے اقوال سے غافل ہیں، نہ سنتے
اور دیکھتے ہیں اور نہ ہی پڑ سکتے ہیں کیونکہ وہ بے جان پتھر ہیں اور قوتِ سماعِ عاری
۲۔ تفسیر فازن میں ہے من لا يستجيب یعنی الاصنام لا تجيب عابديها
الی شیء یستلونها۔

ترجمہ۔ من لا يستجيب سے مراد بت ہیں جو اپنے عابدوں کو وہ اشیا
میں نہیں کر دیتے جن کا وہ مطالبہ کرتے ہیں۔ تفسیر جلالین میں بھی اسی سے ملتی جلتی
تفسیر ہے۔

۳۔ تفسیر کبیر امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ میں سے (الی یوم القیامة) و
انما جعل ذلك غاية لان یوم القیامة قد قیل انہ تعالیٰ یجلیہا
وتقع بیدہا و بین من یعبدها مخاطبة فلذلك جعله
حدا و اذا قامت القیامة وحشر الناس فہذہ الاصنام
تعادى هؤلاء العابدین وتتبوء منہم جلد، ص ۴۱

ترجمہ۔ مجبوراً باطلہ کے جواب نہ دینے کی حد یوم القیامة مقرر فرمائی (جس سے
لازم آئے گا کہ قیامت کے دن وہ ان کو جواب دیں گے۔ حالانکہ بت تو قیامت
کے دن بھی جواب نہیں دے سکتے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ رازی نے
فرمایا) کیونکہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کو زندگی بخشنے کا اور ان کے درمیان
اور مشرکین کے درمیان گفتگو ہوگی۔ لہذا جواب نہ دینے کی حد قیامت کا دن بنا دیا
اور جب قیامت قائم ہوگی، تمام لوگ میدانِ حشر میں جمع ہوں گے، تو یہ بت

اپنے عابدوں کے دشمن بن جائیں گے، ان سے اور ان کی عبادت سے بیزاری ظاہر کریں گے۔

اس کے علاوہ دیگر کتب تفاسیر میں بھی اس آیت کریمہ کی یہی تفسیر کی گئی ہے

اور من لا یتجدیب لہ الی یوم القیامت و ہمد عن دعاہم غفلون کے مصداق صرف اصنام و اوثان کو بنایا گیا ہے۔

کیلانی صاحب کے استدلال کا بطلان و فساد قرآن حکیم سے

حضرت حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ انکم وما تعبدون من دون اللہ حسب جہنم انتم لہا واردون۔

ترجمہ۔ بے شک تم خود اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ جن کی عبادت کرتے ہو، سب کے سب جہنم کا ایندھن ہیں اور تم اس میں داخل ہونے والے ہو۔

اس آیت مبارکہ میں مشرکین مکہ کو خطاب ہے اور بقول کیلانی صاحب یہ عبادت بزرگوں کی ہے جس میں انبیاء کرام اور اولیاء عظام سبھی شامل ہیں تو ان کا

حال من دون اللہ سے مراد؟ چودھری صاحب بعض سماع کے قائل مغربین کے حوالے سے

ثابت فرماتے ہیں کہ من دون اللہ سے مراد صرف بت میں حالانکہ قرآن و حدیث میں بت سے آیت من دون اللہ مذکور ہیں۔ مثلاً شمس مجشری (دستارہ) اصنام، اوثان۔ طاغوت، جن، طاغیہ انبیاء اور اولیاء۔ آیت بالا میں وَاذًا حَبَّرَ النَّاسَ کے الفاظ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہاں من دون اللہ انسانوں کی بات ہو رہی ہے جنہیں پکارا جاتا تھا نہ کہ پتھر کے اصنام کی۔ ہمارا اس بات پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دن پتھروں کے اصنام کو اکٹھا کر سکتا اور انہیں قوت گویائی بخش سکتا ہے مگر جب اس آیت میں ایسا کوئی قرینہ ہی نہیں تو محض قدرت الہی کا ہمارے کہیں من دون اللہ صرف اصنام مراد لینے کی کیا گت ہے۔ سماع کے قائل حضرات دراصل انبیاء و اولیاء کو عن دعاہم غفلون سے معنی قرار دینا چاہتے ہیں مگر کتاب و سنت اس سے ایا کرتے ہیں۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ سے پوچھیں گے۔ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو من دون اللہ بنا نا؟ اس سوال کا جواب کا آخری حصہ عیسیٰ کا یہ جواب ہے کہ جب تک میں ان میں تھا۔ ان کے حالات سے باخبر رہا پھر جب تو نے مجھے دنیا سے اٹھا لیا تو ان کا گول تو ہے (۱) اب اگر عیسیٰ جیسے اولوالعزم پیغمبر جنہیں موت آئی ہی نہیں اور بچھد مغربی آسمان پر زندہ ہیں عن دعاہم غفلون کا خود اقرار کرے ہے میں تو دوسروں کے لیے یہ بات کیسے تسلیم کی جا سکتی ہے۔

جہنم میں داخل ہونا اور ناردوزخ کا ایندھن بننا لازم۔ نعوذ باللہ منہ۔ جبکہ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی محبوب ہستیوں سے متعلق فرماتا ہے۔ الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا هم یحزنون۔

ترجمہ: بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ ہی غمگین ہوں گے۔

ایک اور آیت کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ان الذین سبقت لہم منا الحسنیٰ اولئک عنہا مبعدون لا یسمعون حسیسہا وہم فیما اشتہت انفسہم خالدون لا یحزنہم الفزع الاکبر و تتلقہم لملائکہ ہذاہ یومکم الذی کنتم توعدون۔ ترجمہ۔

تحقیق وہ لوگ جن کے لیے ہماری طرف سے بھلائی کا وعدہ ہو چکا ہے۔ وہ نار جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ وہ نار جہنم کی آواز ذرہ بھر بھی نہ سنیں گے اور اپنی پسندیدہ نعمتوں میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے انہیں سب سے بڑی گھبراہٹ (دہشت قیامت وغیرہ) غم میں نہیں ڈالیں گے اور فرشتے ان کے استقبال کے لیے آئیں گے (یہ کہتے ہوئے) کہ یہ ہے وہ دن جیسا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

تفسیر ابوالسعود میں مذکور ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کریمہ "انکم وما تعبدون من دون اللہ حسب جہنم انتم لہا واردون لو کان ہو لاء الہیۃ ماورد و ہا رکل فیہا خلدون۔

اے مشرکین تم اور تمہارے معبودان باطلہ جہنم کا ایندھن ہیں اور تم سب اس میں داخل ہونے والے ہو۔ اگر تمہارے معبود درحقیقت الہ ہوتے تو دوزخ کی آگ میں داخل نہ ہوتے۔ اور یہ سب ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں،" کو مشرکین پر تلاوت کیا تو ابن زبیر نے کہا کہ ہمارے بت اور اصنام اگر جہنم میں داخل ہوں گے، تو عیسائی حضرت عیسیٰ کی عبادت کرتے ہیں

عہ آنا اللہ!۔ قرآن مجید کی آیات تک غلط لکھ دی ہیں۔ صحیح الفاظ یہ ہیں، وَتَشَکُّمُ وَاَنْتُمْ لَکُمْ

اور یہودی حضرت عزیر کی پرستش کرتے ہیں اور نبی یلع ملائکہ کی پوجا کرتے ہیں۔ لہذا وہ بھی جہنم میں داخل ہوں گے تو اللہ تعالیٰ نے ان بد باطنوں کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ انبیاء کرام اور ملائکہ یا دوسرے اولیاء اور شہداء اور صلحاء کے لیے ہماری طرف سے وعدہ خیر اور پیمان جو دو عطا ہو چکا ہے۔ لہذا ان کا یہ انجام نہیں۔ یہ صرف تمہارے معبودات باطلہ اور ارباب من دون اللہ کا انجام بد اور عاقبتِ قلیح ہے۔

لہذا ثابت ہوا کہ اصنام و انصاب اور صور و تماثل کے حق میں وارد آیات کا انبیاء کرام رسل عظام اور اولیاء شہداء اور صالحین پر چسپاں کرنا محض جہالت اور قرآن و سنت کی قلیح ترین تحریف ہے بلکہ قرآن مجید فرقان حمید کی بہت سے آیات سے سماعِ موتی ثابت ہوتا ہے۔

۱۰ معبودانِ باطل اور بزرگ ہستیاں۔

ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ اگر کسی نے کسی نبی، رسول، شہید اور صالح کی عبادت کی ہے تو اس آیت ”اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبٌ جَعَلْتُمْ“ کے بموجب یہ بزرگ ہستیاں معبودانِ باطل کی عفت سے مستثنیٰ ہی رہیں گی۔ البتہ ان کو پوجنے والے ضرور جہنم میں داخل کیے جائیں گے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم، لیکن اس سے سماعِ موتی کیسے ثابت ہو گیا؟ یہ عقدہ ہماری سمجھ سے بالا ہے۔ شاید اس پر موصوف کچھ روشنی ڈال سکیں۔ اس سے تو الٹا یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ لوگ جو سماعِ موتی کو درست سمجھ کر انہیں پارتے رہے یا عبادت کرتے رہے ہیں ان کو ان کے اس جرم کی سزا یہ ملے گی کہ وہ جہنم میں داخل کیے جائیں گے۔ یہی یہ بزرگ ہستیاں تو چونکہ ان کا اپنا کوئی قصور نہیں، لہذا انہیں دوزخ سے دور رکھا جائے گا اور جو بتوں کو جہنم میں داخل کیا جائے گا تو وہ بھی محض مشرکین کے اس زعمِ باطل کی تردید اور مزید حسرت و مایس کے احساس دلانے کے لیے ہوگا۔ ورنہ پتھر کے بتوں کا اپنا کیا قصور ہو سکتا ہے اور جہنم میں داخل کرنے سے انہیں کیا نقصان پہنچے گا؟

جناب محمد علی صاحب لکھتے ہیں:

”بلکہ قرآن مجید کی بہت سی آیات سے سماعِ موتی ثابت ہوتا ہے“

ثبوت نمبر۔ قال الله تعالى واسئل من ارسلنا من قبلك
من رسلنا اجعلنا من دون الرحمن الهة يعبدون۔

ترجمہ۔ وہ رسول و نبی جو ہم نے آپ سے پہلے مبعوث فرمائے ان سے
پوچھ لیجئے کیا ہم نے ذات رحمن جل وعلیٰ کے بغیر کئی معبود مقرر کیے ہیں جن کی
عبادت کی جاتے یقیناً ایسا نہیں ہے۔

اگر انبیاء کرام میں حیات نہ ہوتی وہ خطاب و ندا کو نہ سمجھتے تو حق تعالیٰ اپنے
محبوب کو دریافت کرنے کا حکم نہ فرماتا۔ تفسیر کبیر جلد سابع ص ۴۳ پر ہے "عبداللہ
ابن عباس سے مروی ہے کہ جب شب اسری نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو
مسجد اقصیٰ پہنچایا گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اور ان کی اولاد
میں سے تمام رسولوں کو آپ کے لیے مسجد اقصیٰ میں جمع فرمایا۔ حضرت جبرائیل
علیہ السلام نے اذان دی اور اقامت کی اور عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
آگے بڑھیے اور نماز پڑھائیے۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت جبرائیل
نے عرض کیا ان رسولوں سے جو ہم نے آپ سے پہلے بھیجے سے دریافت
کر لیجئے (جیسا کی آیت میں ہے) آپ نے فرمایا لا اسئال لانی لست
نشا کافیہ۔ میں نہیں پوچھتا مجھے کوئی شک نہیں۔

ثبوت نمبر۔ قال الله تعالى۔ وقالوا یا صالح ائتنا بما تعدنا
ان كنت من المرسلین فاخذ ترہم الرجفۃ فاصبحون فی
دارہم جثمین فتولی عنہم وقال یقوم لقد ابغتکم رسالۃ
ربی ونصحت لکم ولكن لا تحبون الناصحین۔

اب درج بالا آیت سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس کی توہم نے وضاحت
کر دی ہے۔ باقی جو آیات درج فرما کر آپ نے ثبوت پیش کیے ہیں وہ "واسئل"
کے الفاظ سے شروع ہونے والی آیت کے علاوہ صرف ایک مزید آیت ہے
جو ۱۹ کے تحت زیر بحث آرہی ہے۔
۱۹ اس آیت پر پہلے بحث ہو چکی ہے۔

ترجمہ۔ (قوم صالح علیہ السلام نے ان سے کہا) اے صالح جس عذاب کا تو ہمیں
 وعدہ دیتا ہے وہ ہمارے پاس لے آ، اگر تو درحقیقت مرسلین میں سے ہے۔
 تو زلزلہ نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔ پس وہ لوگ اپنے گھروں میں تباہی
 بربادی سے دوچار ہو گئے اور علیحدہ ہوتے وقت ان سے مخاطب ہو کر کہا
 اے میری قوم میں نے تمہیں رب کے پیغام پہنچائے اور نصیحت کی، لیکن تم
 تو نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

امام رازی نے تفسیر میں فرمایا۔ ”پہلا قول یہ ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام
 کی علیحدگی ان کی ہلاکت کے بعد پائی گئی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ لفظ فاتعیب اور فری
 ترتب پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کا اعراض ہلاکت کے بعد مستحق
 ہوا اور انہوں نے قوم کی ہلاکت کے بعد انہیں خطاب فرمایا جیسا ہمارے نبی پاک صلی اللہ
 علیہ وسلم نے بدر کے مقتول کو خطاب فرمایا۔ آپ سے عرض کیا گیا کہ آپ ان مردوں
 کے ساتھ کلام فرما رہے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں لیکن وہ لوگ
 ایسے جواب پر قادر نہیں جو تم سن سکو۔ جلد رابع ص ۲۵۵ قال ابو السعود مخاطبہم
 علیہ الصلوٰۃ والسلام بذلك خطاب رسول الله صلى الله عليه
 وسلم اهل قليب بدر حديث قال انا وجدنا ما وعدنا ربنا فهل
 وجدتم ما وعدكم حقا۔ جلد رابع ص ۲۱۸
 علامہ ابو السعود فرماتے ہیں کہ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی ہلاکت شدہ قوم کو ایسے

ہلہ نہ ہمیں قلیب بدر کے واقعہ سے انکار ہے نہ ان مفسرین کی تفسیر سے۔ یہ سب
 صورتیں سجزہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور شکی کی صورت میں ہیں۔ لہذا ان واقعات سے
 علی الاطلاق سماع موقی ثابت کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ اس بات سے آخر کے
 انکار ہے کہ اللہ جب چاہے مردوں کو سنا سکتا ہے۔ اختلاف تو اس بات میں
 ہے کہ آیا ہم لوگ بھی مردوں کو سنا سکتے ہیں؟ یا عام حالات میں وہ ہماری بات
 بھی سن سکتے ہیں یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ واقعات ایسا ثبوت مہیا نہیں کرتے۔ بلکہ
 الشاقرآنی نصوص اس کا رد ضرور ثابت کرتی ہیں۔

ہی خطاب فرمایا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے کنوئیں میں پھینکے ہوئے کفار سے خطاب فرمایا۔

اسی طرح حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد خطاب فرمایا۔
ثبوت نمطبر۔ والنار زعت غرقاً والناشطت نشطاً والسابحات
سبحاً فالسابقات سبقاً فالمدبرات امراً۔

متم ہے ان نفوس قدسیہ کی سختی سے جان کھینچیں اور زمی سے بند کھولیں اور آسانی سے تیریں پھر آگے بڑھ کر جلد پہنچیں، پھر کام کی تدبیر کریں۔
مفسرین کرام نے صفات مذکورہ کو ملائکہ کے علاوہ نفوس کاملہ اور ارواح فاضلہ پر بھی منطبق فرمایا ہے۔

علامہ بسید محمود اوسوی اپنی تفسیر میں اس آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں "آیت مذکورہ میں ان نفوس فاضلہ کے ساتھ تسمیں ذکر کی گئی ہیں جو موت کی دہرے سے ابدان سے بزور انگٹ ^{۱۹} کیے جاتے ہیں کیونکہ بدن سے الفت و محبت کی وجہ سے ان کی جلدائی

۱۹ "وَالنَّازِعَاتِ غَرْقًا" کی تفسیر جو آپ نے روح المعانی کے حوالہ سے پیش فرمائی ہے۔ یہ تفسیر بالماثور کے خلاف ہے۔ صحابہؓ اور تابعینؓ سب نے یہاں فرشتے ہی مراد لیے ہیں نہ کہ نفوس فاضلہ۔ اور قابل ذکر امر یہ ہے کہ کثر الایمان کے حاشیہ نویس جناب نعیم الدین صاحب مراد آبادی نے بھی یہاں فرشتے ہی مراد لیے ہیں کیونکہ فرشتے ہی جسم میں ڈوب کر جان کو کھینچ نکالتے ہیں اور مدبرات ^{۱۹} بھی فرشتے ہی ہیں۔ یہاں جناب محمد علی صاحب نے جن چند مفسرین کے نام روح المعانی کی تائید میں پیش فرماتے ہیں یہ سب تصوف زدہ معلوم ہوتے ہیں۔ جنہیں ہر وقت یہ فکر دامگیر ہوتی ہے کہ جہاں تک بن پڑے فوت شدہ اولیاء اللہ کا "تصرف فی الامور" بھی کسی طرح کتاب و سنت سے ثابت کیا جائے۔ روح المعانی کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ آپ معانی کی روح کھینچ کر ایسی تفسیر بیان فرماتے ہیں۔ متصوفین حضرات ظاہری معانی کو پہنچ سمجھ کر بعینہ باطنی معانی کی دریافت میں اپنی کوششیں صرف کیا کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جو تفسیر صاحب روح المعانی نے پیش فرمائی ہے آیا قرآن کریم کے الفاظ ان معانی کے متحمل بھی ہیں یا نہیں؟

بہت مشکل ہوتی ہے۔ جبکہ بدن اعمال خیر میں ان کے لیے بمنزلہ سواری کے ہوتا ہے اور بدن میں رہنا مزید خیر و برکت حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ تب وہ بدنوں سے جدائی کے بعد عالم ملکوت کی طرف بصد شوق گامزن ہوتے ہیں اور عالم ملکوت میں

صاحب روح المعانی کے مطابق آیات نمبر (۱) اور (۲) کے معنی یا تفسیر یہ ہے

”وَالنَّفْسُ عَزْرًا وَالنَّفْسُ طَائِفَةٌ“

”ان نفوس فاضلہ کی قسم جو موت کی وجہ سے بدن سے بزور الگ کیے

جاتے ہیں۔ کیونکہ بدن سے اُلفت و محبت کی وجہ سے ان کی جدائی بہت

مشکل ہوتی ہے۔“

اب دیکھتے درج بالا ترجمہ یا تشریح پر درج ذیل اعتراضات اڑھتے ہیں۔

۱۔ ”نَفْسٌ“ فعل متعدی بمعنی کسی چیز کو اس کی قرار گاہ سے کھینچنا ہے (مفردات)

”نَفْسٌ“ بمعنی جان کنی کا وقت ہے اور ”عَزْرًا“ فعل لازم بمعنی کسی چیز کا ڈوبنا ہے۔

اب اگر یہاں نازعات اسم فاعل یعنی کھینچنے والیاں (اردو و محاورہ کی نسبت

سے کھینچنے والے) سے مراد فرشتے لیے جائیں۔ تو آیت کا مطلب بالکل واضح

ہو جاتا ہے کہ فرشتے انسان کے جسم میں ڈوب کر اس کی رُوح کو نکالتے ہیں

اور یہی بات کتاب و سنت سے بھی ثابت و مسلم ہے۔ لیکن اگر یہاں فرشتوں

کے بجائے نفوس فاضلہ مراد لیے جائیں تو وہ تو پہلے ہی اپنے اجسام میں موجود

ہوتے ہیں۔ ان کے کسی دوسری چیز میں ڈوبنے اور اس کو اس کی قرار گاہ سے

کھینچنے کی کیا تمک ہے؟

۲۔ قرآن نے ”نازعات“ اسم فاعل کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ بمعنی کھینچنے والے

یا والیاں۔ لیکن رُوح المعانی نے اس کا ترجمہ بصورتِ مفعول ”بدن سے بزور

الگ کیے جاتے ہیں“ کیا ہے جو اگر اس کے لحاظ سے غلط ہے۔

۳۔ ”وَالنَّفْسُ طَائِفَةٌ“ فرشتے تو انسان کے جسم کے بند بند اور بوڑ بوڑ

سے جان نکال لاتے ہیں لیکن نفوس فاضلہ جو پہلے ہی جسم میں موجود ہوتے ہیں

اور بدن سے اُلفت و محبت کی وجہ سے ان کی جدائی بہت مشکل ہوتی ہے۔

وہ کیسے بند بند کو کھول سکتے ہیں؟ کیا بدن سے اُلفت و محبت کا تقاضا یہی ہے

پرواز کرتے ہوئے بارگاہِ قدس میں سبقت لے جاتے ہیں، تب اپنے مرتبہ و درجہ اور قدرت و طاقت کی وجہ سے کارکنانِ قضا و قدر میں سے ہر جاتے ہیں۔ تفسیر روح المعانی ص ۲۴ جلد ۳ مطبوعہ مہران۔ علامہ موصوف آگے چل کر لکھتے ہیں۔ "لا یذنبی التوقف فی ان اللہ قد یکرم من شاء من اولیاءہ بعد الموت کما یکرمہ قبلہ بما شاء فیبرئ سبحانہ المریض وینقذ الغریق وینصر علی العدو وینزل الغیث وکیت وکیت کرامتہ۔" روح المعانی جلد ۳ ص ۲۵۔

ترجمہ۔ اس امر میں توقف و تردد کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ اپنے اولیاء کو وصال کے بعد بھی کرامتوں سے نوازتا ہے، جیسا کہ حالت حیات میں پس کبھی مریدوں کو ان کے ہاتھ پر بطور کرامت شفا بخشتا ہے۔ کبھی کسی کو غرق ہونے

کے وہ اس کے بند بند کو خود ہی کھولنا شروع کر دیں؟ غالباً یہی وجہ ہے کہ صاحب روح المعانی نے "وَالنَّشْطَاتِ نَشْطًا" کا ترجمہ یا تفسیر ہی چھوڑ دی اور اس کے بجائے جو فقرہ درج فرمایا کہ "ان نفوس فاضلہ کو بدن سے الفت و محبت کی وجہ سے جدائی بہت مشکل ہوتی ہے؟" یہ دراصل ان کی اپنی طرف سے پہلی آیت کی مزید تشریح و تفسیر ہے۔

۴۔ جن نفوس کو اپنے بدن سے اتنی الفت و محبت ہو وہ فاضلہ ہو کیسے کہتے ہیں؟ عام نفوس کو تو فی الواقعہ بدن سے محبت ہوتی ہے لیکن نفوس فاضلہ کو بدن سے ایسی محبت قطعاً نہیں ہوتی۔ یا پھر ایسے نفوس فاضلہ ہوتے ہی نہیں۔ ترجمہ میں نفوس فاضلہ کے اضافہ کے فوائد۔

بات دراصل وہی ہے جو ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ یہ اہل طریقت حضرات "فَالْمَدَّ تَرَاتِ اَحْرًا" میں اپنے مرعومہ "اولیاء اللہ" کو شریک بنانا چاہتے ہیں۔ لہذا انہوں نے پہلی آیت نیکے نفوس فاضلہ کا لفظ شامل کر کے اس کے لیے بنیاد سہوار کرنا شروع کر دی۔ اور تان یہاں آ کر ٹوٹی کہ "اس امر میں توقع و تردد کی کوئی گنجائش نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے "اولیاء" کو مرنے کے بعد بھی کرامتوں

سے بچاتا ہے کبھی دشمنوں پر غلبہ دیتا ہے تو کبھی ان کے عرض کرنے پر بارش برساتا ہے وغیرہ

علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی - حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی -
علامہ اسماعیل سہتی - امام فخر الدین رازی قاضی شہارہ اللہ پانی پتی صاحب تفسیر
نظری نے بھی اسی سے ملتی جلتی تفسیر بیان کی ہے۔

ثبوت سماع موتی احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے!
۱- سماع موتی کے باب میں قلیب بدر والی حدیث مشہور و معروف ہے۔
جو حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت عثمان خطاب رضی اللہ عنہ -
حضرت ابوطالب رضی اللہ عنہ حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ، حضرت
عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ جیسے کبار صحابہؓ سے مروی ہے۔ ان کی روایات
بخاری مسلم شریف میں موجود ہیں۔

۲- قیمت جو تینوں کی آہٹ کی آواز سنتا ہے۔ یہ حدیث بھی سماع موتی پر

سے نوازتا ہے جیسا کہ حالت حیات میں

سوچنے کی بات ہے کہ وفات نبویؐ کے وقت چار لاکھ کے قریب مسلمان
موجود تھے اور سو لاکھ تو حججہ الوداع کے موقع پر موجود تھے اور یہ دو صحابہ کرامؓ
شام تک پھیلا ہوا ہے۔ اب ان چار لاکھ صحابہ کرامؓ سے پورے سو سال
کے عرصہ میں صرف بارہ کرامات مذکور ہیں۔ پھر ان بارہ میں سے بھی بعض روایات
ضعیف و مجروح ہیں۔ لیکن ہمارے ان اولیاء اللہ میں سے ہر ایک ولی کی
زندگی کرامات سے بھر پور ہوتی ہے۔ پھر مرنے کے بعد بھی ان کی کرامات کا سلسلہ
بدستور جاری رہتا ہے۔ تو کیا ان اولیاء اللہ کے نفوس صحابہ کرامؓ سے
بہت زیادہ فاضلہ ہیں جن کی کرامات اور تصرف فی الامور کا یہ عالم ہے۔!

۳- قلیب بدر اور مردہ کے عورتوں کی چاپ سننے والی احادیث:

یہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔ اور ان پر میں پہلے بھر لو پڑ بحث کر چکا ہوں۔
ان میں پہلی حدیث معجزہ سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری ایک اصنطرافی امر

دولت کرتی ہے۔ یہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ حضرت برابر بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

۳۔ اخرج الطبرانی فی الاوسط عن ابن عمرو واخرج الحاكم وصححه والبیہقی عن ابو ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انه وقف علی مصعب بن عمیر حین رجع من احد فوقف علیہ وعلی اصحابہ فقال اشهد انکم احياء عند اللہ فزورواہم وسلموا علیہم فوالذی نفسی بیدہ لا یسلم علیہم احد الا ردوا علیہ الی یوم القیامتہ

شرح الصدور ص ۸۵

تبھی طبرانی نے اوسط میں بعد ان ابن عمرو رضی اللہ عنہ سے نقل کیا اور حاکم و بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا، حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا۔ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب احد سے مراجعت فرماہوتے تو حضرت مصعب ابن عمیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے مزارات پر تشریف لے گئے اور فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ تم اللہ تعالیٰ کے نزدیک زندہ ہو۔ پھر اپنے اہلیوں صحابہ کرام اور بعد میں آنے والوں کو حکم فرمایا کہ ان شہداء کرام کی زیارت کرو اور

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام کی کثیر تعداد ان حدیثوں کو جلننے کے باوجود علی الاطلاق سماع موثق کی منکر ہے۔

۲۔ طبرانی، حاکم اور بیہقی تیسرے درجہ کی کتب احادیث ہیں؛ طبرانی، حاکم اور بیہقی تینوں کتابیں تیسرے درجہ کی ہیں۔ ان سے اگر جواز ثابت ہو بھی جائے تو قابل احتجاج نہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بالوصاحت لکھ چکا ہوں۔ کہ احادیث میں سے تیسرے اور چوتھے درجے کی احادیث سماع کا جواز ثابت کرتی ہیں۔ یہ یاد رہے کہ صحاح ستہ میں سے بخاری اور مسلم اول درجہ کی، باقی چار کتابیں درجہ دوم کی ہیں۔ اور ان کے علاوہ باقی تمام کتب احادیث درجہ سوم اور چہارم کی ہیں۔

ان پر سلام بھیجو، مجھے اس ذات اقدس کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ جو شخص بھی قیامت تک انہیں سلام دے گا یہ شہداء کرام اس کا جواب دیں گے۔

اس روایت سے شہداء کا زائریں کو ماننا سلام سنا، جواب دینا ثابت ہوتا ہے۔ جب شہداء میں یہ چیز ثابت ہو گئی تو اولیاء کا ملین صدیقین اور انبیاء کرام میں بطریق اولی ثابت ہو جائے گی۔ کیونکہ فضیلت میں شہداء تیسرے نمبر پر ہیں۔ کیا کیلانی صاحب کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کے بعد کبھی اور کی شہادت بھی درکار ہے؟
سماح موفی اور صحابہ کرامؓ؛

۴۔ روی ابن عبد البر بسند صحیح ما من احد یمر بقبر اخیه المؤمن کان یعرفه فی الدنیا فیسلم علیہ الا عرفه ورد علیہ السلام صحیحہ عبد الحق رواہ ابن عبد البر فی الاستذکار والتمہید عن ابن عباس رضی اللہ عنہ۔ (شرح الصدور ص ۸۴، طحطاویؒ ص ۳۶۶۔)

ترجمہ۔ ابن عبد البر نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ کوئی شخص بھی جب اپنے مومن بھائی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے جسے صاحب قبر دنیا میں جانتا تھا۔ پس سلام دیتا ہے تو صاحب قبر اسے پہچان لیتا ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔ اس روایت کو محدث عبد الحق نے صحیح کہا اور ابن عبد البر نے استذکار و تمہید میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

۵۲۲۔ یہ حدیث موضوع ہے۔

یہ حدیث جو شرح الصدور اور طحطاوی کے حوالہ سے پیش کی گئی ہے موضوع ہے۔ اور اسے میں موضوع حدیث ۷۱۲ کے عنوان کے تحت ص ۵۴ اور ۵۵ پر زیر بحث لایا جا چکا ہوں۔ اور محدث عبد الحق صاحب کے نزدیک تو ایسی روایات بہر حال صحیح ہی ہونی چاہئیں۔

۵۔ روی مسلم عن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قال لا بنہ وھو فی سیاق الموت اذا انامت فلا تصبني ناحتہ ولا نار فاذا دفتمونی فشنو علی التراب شنا ثم اقیمو حول قبری قدر ما ینحر جزو رو یقسم لحد حتی استانس بکم واعلم ما ذالرا جع بہ رسل ربی مشکوٰۃ شریف ص ۱۳۹ باب دفن المیت۔

ترجمہ۔ مسلم شریف میں حضرت عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ جب وہ قریب المرگ تھے انہوں نے اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا جب میں فوت ہو جاؤں تو کوئی توہ کرنے والی عورت میرے ساتھ نہ چلے اور نہ آگ میرے ہمراہ لائی جائے (جیسا کہ رسم جاہلیت تھی) جب مجھے دفن کر چکو تو مجھ پر آہستہ آہستہ مٹی ڈالنا پھر میری قبر کے پاس اتنی دیر کھڑے رہنا جتنی دیر اونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کیا جاسکتا ہے تاکہ میں تم سے انس حاصل کروں اور پورے وثوق کے ساتھ اپنے رب کے بھیجے ہوئے ملائکہ کو ان کے سوالوں کا جواب دے سکوں۔

۲۳۔ حدیث صحیح ہے لیکن استنباط غلط،

یہ حدیث صحیح ہے۔ مگر اس کا بونتیجہ پیش کیا گیا ہے، وہ درست نہیں۔ کیونکہ یہ حضرت عمرو بن العاصؓ کا اپنا خیال اور تدبیر تھی۔ اور یہ ویسا ہی خیال اور تدبیر تھی جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے لڑکوں کو تاکید کی تھی کہ جب مصر پہنچو تو ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا۔ اس پر اللہ رب العزت نے فرمایا:

”مَا كَانَ يُعْفَى عَنْهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسٍ يَعْقُوبَ قَضَاهَا“ (یوسف ۶۸)

”وہ تدبیر خدا کے حکم کو ذرا بھی ٹال نہیں سکتی تھی۔ ہاں وہ یعقوب کے دل کی بس خواہش تھی جو انہوں نے پوری کی تھی۔“

(ترجمہ فتح محمد جالندھری)

حضرت عمرو بن العاص نے یہ وصیت اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ ابن عمرو کو کی اور حضرت عبداللہ نے اسے خلاف قرآن و سنت نہ سمجھا، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ صحابہ کرام کے نزدیک اہل قبور کا زائر کو جاننا پہچاننا اور اس حاصل کرنا مشہور و معروف تھا ورنہ ان کے صاحبزادے جو خود بھی ایک جلیل القدر صحابی ہیں یہ ضرور کہتے کہ آپ تو وہاں بے جان لاش ہوں گے میرے وہاں ٹھہرنے کا کیا فائدہ؟

اس کے علاوہ دیگر صحابہ کرام سے بھی مختلف کتب احادیث میں سماع موتی کی مؤید روایات موجود ہیں۔

حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور سماع موتی حضرت ام المؤمنین کے انکارِ سماع پر ایک نظر)

مولانا کیلانی صاحب نے حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے انکار کو بنیاد بنا کر مقتولین بدر اور سماع موتی پر دلائل کرنے والی تمام روایات کو مردود اور ناقابلِ اعتماد ٹھہرایا ہے اور ان کی روایت قبول کرنے کا سبب ان کا نکتہ بتایا ہے۔ موصوف کا حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سے استدلال چند وجوہ کی

تو جس طرح حضرت یعقوب کی یہ تدبیر مشیت الہی کے مقابلہ میں بے اثر ہونے کے باوجود شریعت کے منافی نہ تھی۔ بالکل یہی صورت حضرت عمرو بن العاص کی تدبیر کی ہے جو انہوں نے محض اپنی دمجی کے واسطے بتلائی۔ یہ تدبیر بھی کتاب و سنت کے منافی نہیں تھی۔ تاہم یہ مطابق بھی نہ تھی۔ کیونکہ اگر مطابق ہوتی تو اکیلے حضرت عمرو بن العاص کا کیا ذکر بہت سے صحابہ کرام ایسی وصیتیں کر جاتے بلکہ خود حضور اکرم نے "لَقَدْ نُوِّمُوا كَهْمَا" کا ارشاد فرمایا تھا، اسی طرح اس سوانح کے لیے بھی کوئی ارشاد فرمادیتے۔

پھر یہ بات ملحوظ خاطر ہے کہ حضرت عمرو بن العاص نے یہ بات سکرات موت کی بحرانی کیفیت میں کہی اور یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کے بیٹے عبداللہ نے اس وصیت پر عمل بھی کیا تھا یا نہیں؟

بناہ پر غلط ہے۔
اول حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کا یہ قول اپنے اجتہاد و استنباط پر

بنی ہے۔

دوم۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے خود بہ ضابطہ و قاعدہ بیان فرمایا ہے کہ جس کو واقعہ کا مشاہدہ ہے اس کا قول راجح و مختار ہے۔ مسلم شریف میں ہے کہ حضرت شریح ابن ہانی نے حضرت ام المؤمنین سے مسخ خفین کی مدت سے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا۔

علیت ہا بن ابی طالب فاساء لہ کان یسافر مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و فی روایۃ علیاً فانہ اعلم بذالک منی۔ مسلم جلد اول ص ۱۳۵

ترجمہ۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو اور ان سے دریافت کروہ سفر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے تھے۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ انہیں اس معاملہ میں مجھ سے زیادہ علم ہے۔

اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ جس کو واقعہ کا علم زیادہ ہے اسی کا قول معتبر ہے اور اس کا علم دوسروں سے بہر حال زیادہ ہے جو موقعہ پر موجود ہو۔ چونکہ بڑی صحابہ موقعہ کے گواہ ہیں اور خود آنحضرت کے سامنے تعجب کا اظہار کرنے حقیقت حال دریافت کرنے والے ہیں لہذا انہیں کا قول

۲۳ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سماع موقی سے انکار کی بنیاد، اجتہاد و استنباط؛

حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کا یہ قول اگر آپس کے اپنے اجتہاد و استنباط پر مبنی ہے، تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی اپنے اجتہاد و استنباط ہی کی بنا پر سماع موقی کے قائل تھے۔ گویا وہاں بھی بات اجتہاد و استنباط ہی کی ہے؛
۲۴ موقع کے گواہ؛

چوہدری صاحب نے روح المعانی کے حوالہ سے فرمایا ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطاب کے وقت موجود نہ تھیں۔

معتبر ہے۔

علامہ محمود آلوسی صاحب روح المعانی فرماتے ہیں "امام سہیلی نے فرمایا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطاب کے وقت موجود نہ تھیں لہذا ان کے علاوہ جو صحابہ کرام وہاں موجود تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کو زیادہ محفوظ رکھنے والے ہیں۔ ترجمہ جلد ۲۱ ص ۵۔

سوم۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت "کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ مقتول اس کو سن رہے ہیں" کے جواب میں فرمایا کہ حضور علیہ السلام نے یہ فرمایا تھا "کہ یہ مردار جانتے ہیں کہ جو کچھ میں انہیں کہا کرتا تھا وہ سچی ہے۔ محدثین نے فرمایا کہ دونوں روایتوں میں مخالفت نہیں ان کے لیے علم ممکن ہے تو سماع بھی ممکن ہے۔ منکر بن سماع حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جو روایت پیش کرتے ہیں اس میں یہ تصریح موجود ہے کہ آپ قلب بدر پر تشریف لے گئے اختلاف ہے تو صرف اس میں کہ حضور علیہ السلام

لیکن مشکل یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ بھی قلب بدر کے واقعہ کے وقت خود موجود نہیں تھے۔ ان کو جنگ بدر اور جنگ احد دونوں موقعوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کم سنی کی بنا پر جہاد میں شرکت کی اجازت ہی نہ دی تھی۔ انہیں پہلی مرتبہ جنگ خندق میں شمولیت کی اجازت ملی اور اس وقت ان کی عمر پندرہ سال تھی (دائرة المعارف الاسلامیہ مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور جلد ۱۲ ص ۸۰ زیر عنوان عبد اللہ بن عمرؓ)

نص میں اجتہاد نہیں۔

پھر موقع کے گواہ کے ضمن میں چودھری صاحب نے جو حضرت عائشہؓ کے حوالے سے مثال پیش فرماتی ہے وہ قیاس مع الفارق ہے رسول اللہ کا مسح علی الخفین کی مدت سب کا نص ہے جس میں اجتہاد کی گنجائش نہیں۔ جبکہ سماع موثی کا مسئلہ ایک اجتہاد مسئلہ ہے جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا اجتہاد دوسرے صحابہ کرام کے اجتہاد سے مختلف تھا۔

نے صحابہ کرام کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے کیا الفاظ فرمائے۔

چہارم۔ حضرت ام المؤمنین صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اگرچہ پہلے سماع کی نفی فرمائی لیکن بعد میں رجوع کر لیا حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ”تحقیق ذکر کردہ است در مواہب لدنیہ کہ در مغازی محمد بن اسحاق باسناد جید و در سند امام احمد بن حنبل باسناد حسن از عائشہ رضی اللہ عنہا مثل حدیث عمر رضی اللہ عنہ آمدہ۔ پس گویا عائشہ (رضی اللہ عنہا) رجوع کو از

۵۲۶۔ یہ معجزہ کی صورت ہے:

یہ معلوم ہونے کے بعد کہ نہ تو حضرت عائشہ موقعہ پر موجود تھیں اور نہ عبد اللہ بن عمر، تو اب ہمیں لامحالہ قتادہ عن انس بن مالک عن ابی طلحہ کی روایت اور ان کے استنباط پر اخصار کرنا پڑے گا۔ صحابہ کرام کے سوال کے جواب میں رسول اللہ نے جو الفاظ بیان فرماتے تھے، وہ یہ ہیں:

”مَا أَنْتُمْ بِأَسْمَعِ لِمَا أَقُولُ مِنْهُمْ“ (بخاری کتاب اللغای

باب قتل ابی جہل)

یعنی جو کچھ میں کہ رہا ہوں۔ یہ تمہارے بھی ایسے ہی سن رہے ہیں جیسے

تم سن رہے ہو۔

اور حضرت قتادہ کا یہ استنباط بھی سماع موتی کے سلسلہ میں چندال

منفید نہیں۔ کیونکہ ان الفاظ سے واضح ہے کہ یہ معجزہ کی صورت ہے۔

۵۲۷۔ سماع موتی کے انکار سے حضرت ام المؤمنین کا رجوع؟

یہ عبدالحق محدث صاحب کا اپنا خیال ہے۔ کوئی حدیث تو درج نہیں فرمائی، بس چند کتابوں کے نام گنوا دیے ہیں۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ حضرت عائشہ کا سماع موتی سے انکار تو بخاری سے ثابت ہو، لیکن رجوع مواہب لدنیہ اور مغازی محمد بن اسحاق جیسی کتابوں سے؛ — ہاں اگر وہ کوئی حدیث درج فرمادیتے تو مسند احمد بن حنبل کی طرف رجوع کیا جاسکتا تھا۔

انکار سبب آنچه ثابت شود نزد وے از روایت ثقات صحابہ کبار زیراکہ وے
رضی اللہ عنہا حاضر نہ ہو در آں قفسیہ و در شرح مسلم نیز مثل ایں مذکور شد۔
مدارج النبوت، اشعة اللمعات شرح مشکوٰۃ جلد سوم ص ۲۲۲

باب سماع میں حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی روایات

۱- اخراج بن ابی الدنیائی کتاب القبور عن عائشة رضی اللہ
عنہا قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما من رجل
یزور قبر اخیه ویجلس عنده الا استانس به وورد علیہ حتی
یقوم۔ شرح الصدور ص ۴۲

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا نہیں کوئی ایسا شخص جو کہ اپنے بھائی کی قبر کی زیارت کرتا ہے
اور اس کے پاس بیٹھتا ہے مگر اسے اس کے ذریعہ انس اور راحت و سکون میسر
آتا ہے۔ سلام کا جواب بھی دیتا ہے۔ اور یہ سکون اس وقت تک حاصل
رہتا ہے جب تک بیٹھا رہے۔ جب وہاں سے رخصت ہوگا تو یہ حالت
ختم ہو جائے گی۔

۲- عن ابن ابی ملیکۃ قال لما توفی عبد الرحمن بن ابی بکر
رضی اللہ عنہما بالحبشی فحمل الی مکة فدفن بہا
فلما قدمت عائشۃ رضی اللہ عنہا امت قبر بن ابی بکر
فقالت ۛ وکنا کئنا ما فی جذیۃ حقبتہ۔ من الدھر حتی
قیل لکن یتصدغان فلما تفرقنا کافی وما لکا۔ لظول اجتماع
لم نبت لیلة معا۔ ثم قالت واللہ لو حضرتک ما دفنت
الا حیث مت ولو شہدتک ما دفرتک۔ رواہ الترمذی

۲۸ ابن ابی الدنیائی کی روایات؛

ابن ابی الدنیائی کے متعلق پہلے و مناسحت ہو چکی ہے کہ اس کی روایات
قابل احتجاج نہیں۔

مشکوٰۃ شریف ص ۱۴۹

ترجمہ - ابن ابی ملیکہ سے مروی ہے کہ جب عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ مقام جلثے میں فوت ہو گئے تو انہیں وہاں سے مکہ مکرمہ کی طرف منتقل کئے وہاں دفن کر دیا گیا۔ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مکہ مکرمہ تشریف لائیں تو اپنے بھائی عبدالرحمن کی قبر پر تشریف لائیں اور فرمایا یہ ہم جزیہ کے دو صاحبوں کی طرح زمانہ کا ایک طویل حصہ اکٹھے رہے، حتیٰ کہ کہا گیا کہ یہ ہرگز جدا نہ ہوں گے اور جب ہم جدا ہو گئے تو گویا میں اور مالک باوجود عرصہ دراز تک اکٹھے رہنے کے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک رات بھی اکٹھے نہیں رہے تھے۔

پھر اپنے بھائی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا، بخدا اگر میں اس وقت موجود ہوتی جبکہ آپ کا انتقال ہوا تھا تو آپ وہیں دفن کیے جاتے جہاں آپ کا انتقال ہوا تھا۔ اور اگر اس وقت حاضر ہوتی تو اب تیری زیارت نہ کرتی۔ شیخ عبدالحق محدث فرماتے ہیں کہ چونکہ انداز مطہرات کا بغیر کسی ضرورت و مجبوری کے اپنے گھروں سے نکلنا روا نہیں تھا، اس لیے فرمایا کہ میں اگر اس وقت الوداع کر لیتی تو اب زیارت نہ کرتی۔“

حضرت ام المؤمنین صدیقہ رضی اللہ عنہا کا خطاب اور الوداع کہنے کے لیے قبر پر تشریف لے جانا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت صدیقہ کے نزدیک بھی صاحب قبر کو زائر کا علم ہوتا ہے اور وہ اس کے کلام کو سنتا ہے۔

۲۵ حضرت ام المؤمنین کا اپنے بھائی سے خطاب:

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ نے اپنے بھائی عبدالرحمن بن ابوبکرؓ کی قبر کی زیارت کی، جو ان کی عدم موجودگی میں دفن کیے گئے تھے۔ اور قبر پر جا کر تمیم کے دو شعر بھی پڑھے جو اس نے اپنے بھائی مالک کی وفات پر مرثیہ کے طور پر کہے تھے۔ پھر یہ کہا کہ اگر میں تمہاری وفات کے وقت موجود ہوتی تو تمہیں اسی جگہ دفن کرتی۔ جہاں تم فوت ہوئے تھے اور تمہاری موت کے وقت میں موجود ہوتی تو تمہاری قبر پر

ترمذی شریعت کی یہ روایت ابن ابی الدنیا کی روایت کی مؤید ہے۔
امام ترمذی کی صحیح روایت کے بعد یہ عذر بھی ختم ہو گیا کہ امام ابن ابی الدنیا
ضعیف محدث ہے۔ ویسے جب ذہن میں پہلے ہی ایک غلط معروضہ
قائم کر لیا جاتے پھر کوئی بھی روایت ہو وہ ضعیف ہوتی چلی جاتے گی۔
احمد، حاکم کی یہ روایت بھی ان روایات کی تصدیق کرتی ہے۔

عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت کنت ادخل البیت
فاضع ثوبی واقول اتمازوجی وابی فلما دفن عمر معہما ما

بھی نہ آتی۔

اب دیکھیے ایسا خطاب تو لوگ اپنے مرے ہوتے عزیزوں کو اکثر کیا
ہی کرتے ہیں۔ حالانکہ انہیں یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ وہ سن نہیں رہے۔ اور
شاعر حضرات تو ہوا کو مخاطب کر کے اس کے ذمہ پیغام رسانی کا فریضہ بھی لگا
دیتے ہیں، صرف مخاطب کرنا تو بڑی آسان بات ہے۔ مثلاً اقبال کہتا ہے کہ
اے ہمالہ! اے فیصل کشور ہندوستان چومتا ہے تیری پیشانی کو مجھے آسمان
تو کیا اس سے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اقبال کا یہ عقیدہ تھا کہ ہمالہ پہاڑ بھی
میرا یہ خطاب سن رہا ہے؟ اس طرح کا طرز خطاب تو محض اپنے جذبات کے
اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ ایسی باتوں کو عقیدہ کی بنیاد بنانا آخر کہاں تک درست
ہے؟ اگر آپ نے سماع موٹی کو احادیث سے ثابت کرنا ہی تھا تو اس سے تو
وہ حدیث بدرجہا مفید تھی۔ جس میں مسلمانوں کو قبرستان جا کر سلام دعا کہنے کی
تلقین کی گئی ہے۔ لیکن اس کا جواب بھی ہم اپنے مضمون میں دے چکے ہیں۔
۳۔ ابن ابی الدنیا کی ثقاہت؟

ترمذی کی اس روایت سے ابن ابی الدنیا ثقہ راوی کیسے بن گیا؟ ترمذی کی یہ
روایت ابن ابی ملیکہ کی ہے اور اس میں صرف خطاب ہی خطاب ہے۔ جبکہ
ابن ابی الدنیا کی روایت یوں ہے کہ مرؤسے صرف سلتے ہی نہیں، خواب
بھی دیتے ہیں۔ تو جب تین حدیث میں ہی اسو کی اختلاف ہو تو ابن ابی الدنیا
کو کیسے معتبر راوی قرار دیا جاسکتا ہے؟

دخلت۔ الا وانا مشدودة علی ثیابی حیاء من عمر مشکوة
 ص ۱۵۲، شرح الصدور ص ۸۲۔ ترجمہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ
 عنہا فرماتی ہیں میں اپنے حجرۃ اقدس میں داخل ہوتی تھی جس میں رسول خدا علیہ السلام
 آرام فرماتے ہیں تو پردہ کا اہتمام نہ کرتی تھی اور دل میں ہمتی تھی یہ تو میرے خاوند
 ہیں اور دوسرے میرے والد ہیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ دفن ہوئے
 تو بخدا میں بغیر اچھی طرح پردہ و حجاب کیسے ہرگز داخل نہ ہوتی۔ حضرت عمر
 رضی اللہ عنہ سے حیا کرتے ہوئے علیہ السلام

۱۔ فوت شدہ بزرگوں سے عورتوں کا پردہ؟

یہ روایت بھی کئی وجوہ کی بنا پر محل نظر ہے۔ مثلاً:-

۱۔ یہ روایت مشکوة باب زیارت القبور کی تفسیر فی فصل میں درج ہے اور مشکوة کی تفسیری
 فصل کی بیشتر روایات ناقابل احتجاج ہیں جیسا کہ میں اس کتاب کے ص ۴۲ پر تفصیل
 سے بیان کر چکا ہوں۔ یہ روایت صحاح میں کہیں مذکور نہیں۔ چوہدری صاحب نے خود
 بھی اس کا دوسرا حوالہ شرح الصدور سے دیا ہے۔

۲۔ رسول اللہ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی قبور حضرت عائشہؓ کے حجرہ یا گھر میں
 ہی تو تھیں پھر حضرت عائشہؓ اپنے ہی گھر میں اور کہاں سے داخل ہوتی تھیں آپؓ
 کا یہ گھر کوئی دو چار کنال کا بنگلہ تو نہ تھا کہ قبور کی طرف آئیں تو پردہ فرمائیں اور وہاں
 سے جانا ہو تو پردہ اٹھالیں۔ آپؓ کے اس گھر کے تقریباً تہائی حصہ میں یہ قبور تھیں۔ باقی
 جگہ آپؓ کی رانش گاہ تھی۔ قبور کے ساتھ بیرونی دیوار تھی جس میں کوئی دروازہ نہ تھا۔
 ایک عبداللہ بن عمرؓ ہی ایسے صحابی تھے جو کبھی کبھار حضرت عائشہؓ سے اذن لے کر گھر کے
 دروازہ سے آتے اور تینوں قبور کے پاس کھڑے ہو کر سلام کہتے تھے حضور اکرمؐ کی قبر
 مبارک کو اس طرح بند رکھنے کی وجہ آپؓ کا یہ فرمان تھا کہ ”میری قبر کو زیارت گاہ نہ بنانا
 بلکہ دو روز دیک جہاں کہیں بھی تم مجھ پر سلام پڑھو وہ مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔“
 اس صورت حال کو سامنے رکھ کر اندازہ کر لیجئے کہ حضرت عائشہؓ کب ایسا سخت پردہ
 کرتی ہوں گی اور کب اٹھاتی ہوں گی؟ ایسا سخت پردہ کرنے سے کیا یہی بہتر نہ تھا کہ
 وہ حضرت عمرؓ کو اپنے گھر میں دفن ہونے کی اجازت ہی نہ دیتیں؟

اس روایت سے حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کا نظریہ بہ اہل قبور سے متعلق واضح ہو گیا کہ حضرت سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حیات برزخ کی قائل ہیں۔ اس کے علاوہ بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے چند روایات مروی ہیں جن سے سماع موتی ثابت ہوتا ہے جیسے "میت کی ہڈی توڑنا ایسا ہے جیسا سگہ زندہ شخص کی ہڈی توڑنا۔" (یہ سماع موتی ثابت ہو رہا ہے۔ ناقل) ان روایات کی روشنی میں جناب کیلانی صاحب کا یہ دعویٰ محض غلط ہے کہ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سماع موتی کی منکر ہیں۔

۳۔ حضرت عائشہؓ تو سماع موتی کی بھی قائل نہ تھیں۔ اب یہ بعد از مرگ حضرت عمرؓ کے انھیں دیکھنے اور حضرت عائشہؓ کے پردہ کرنے کا معاملہ تو اور بھی سخت ہے۔ پھر یہ بات بھی ناقابل فہم ہے کہ اگر قبر پر نمونہ مٹی سے حضرت عمرؓ حضرت عائشہؓ کو دیکھ سکتے ہوں تو معمولی کپڑے کا حجاب ایسی نظر کے لیے روک کیونکر بن سکتا ہے؟

۴۔ کیا حیات برزخ اور سماع موتی لازم و ملزوم ہیں؟

چودھری صاحب لے لکھا ہے کہ حضرت سیدہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حیات برزخ کی قائل ہیں۔ سوال یہ ہے کہ حیات برزخ کا کون قائل نہیں؟ حیات برزخ سے انکار تو عذاب و ثواب قبر کے انکار کے مترادف ہے۔ اور میں نے اپنے مضمون میں اس حیات برزخ کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر اس حیات برزخ سے یہ کب لازم آتا ہے کہ فوت شدہ لوگ ہم اہل دنیا کی باتیں سنتے اور ان کا جواب بھی دیتے بلکہ حاجت روائی اور شکل کشائی بھی کرتے ہیں؟

۵۔ سماع موتی یا احترام آدمیت؟ اب تک چودھری صاحب نے حضرت عائشہؓ کی جو تین مرویات پیش فرمائیں ان میں سے پہلی ابن ابی الدنیا کی ہے جو ناقابل احتجاج ہے دوسری روایت، جس میں حضرت عائشہؓ کا اپنے بھائی کو خطاب مذکور ہے، کے راوی ابن ابی ملیکہ ہیں نہ کہ حضرت عائشہؓ خود۔ اس روایت کو خواہ مخواہ حضرت عائشہؓ کی مرویات میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اور تیسری روایت حضرت عمرؓ کی قبر سے حضرت عائشہؓ کے پردہ کرنے کی ہے جس پر ابھی بحث ہوئی۔ اور یہی بات میں بہ تکرار ذکر کر چکا ہوں کہ موضوع،

مولانا جبرائیل نے روح، عذاب، قبر، سماح موتی سے متعلق مضمون کی دوسری قسط میں ایک جگہ لکھا ہے "سیرت کی بات ہے کہ سماح موتی اور اسی طرح سلوک و تصرف حقیوں اور بالخصوص بریلوی طبقہ میں اتنا مقبول کیوں ہو گیا جبکہ امام ابو حنیفہ سماح موتی کے مخالف تھے۔ اور آگے امام صاحب سے متعلق واقعہ درج کیا ہے۔"

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے سماح موتی کے متعلق نفی میں کچھ بھی ثابت نہیں اور جو روایات امام موصوف سے منسوب

مجروح اور ضعیف روایات ہی سماح موتی کے جواز کا سبب بڑا سہارا ہیں۔ پھر ایسی روایات کو پیش کرنے کا فائدہ؟

اور اب سماح موتی کے جواز میں یہ جو چھٹی روایت پیش کر کے تو چودھری صاحب نے کمال ہی کر دیا ہے۔ ع۔ جو بات کی خدا کی قسم لا جواب کی

ہم بعد احترام چودھری صاحب کی خدمت میں یہ گزارش کریں گے کہ اس حدیث میں قابل ذکر بات احترام آدمیت سے نہ کہ سماح موتی۔ احترام آدمیت یہ ہے کہ انسانی جسم انسان کی اپنی ملکیت نہیں بلکہ خدا کی ملکیت ہے۔ کوئی شخص اپنی مرضی سے اپنے جسم کو نہ نقصان پہنچانے کا حق رکھتا ہے، نہ خودکشی کرنے کا۔

۲۔ صرف انسان کو مرنے کے بعد دفن کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تاکہ اسے دردے وغیرہ چیر بھیاڑ نہ کھائیں۔ اور کسی جاندار کو مرنے کے بعد دفن کرنے کا حکم نہیں۔

۳۔ کوئی شخص بھی کسی انسانی لاش میں کسی قسم کا تصرف نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ خود مرنے والا بھی ایسی وصیت نہیں کر سکتا۔ مثلاً یعنی کسی انسانی لاش کے اعضاء کاٹنے

گو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے میت کی ہڈی توڑنا بھی اسی قبیل سے ہے۔

اب اگر اس حدیث سے بھی جو چودھری صاحب سماح موتی ثابت کرنا چاہیں تو ایسی سینکڑوں حدیثیں آپ کو آدھری مل سکتی ہیں اور ہم پڑھنے سے ایک نظر قائم کرنے کی وجہ سے نہ مانتے "کا الزام بھی بدستور برقرار ہے گا۔"

۳۲ امام ابو حنیفہ سے منسوب روایات؛

روایات کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ گو میں نے ایک روایت درج کی تھی، لیکن اور بھی روایات ہیں۔ اب یہ روایات شاذ ہیں یا ناقابل اعتبار، اس کا

کی جاتی ہیں وہ شاذ اور ناقابل اعتبار ہیں۔
 مسلک دیوبند کے نامور عالم مولوی رشید احمد گنگوہی لکھتے ہیں امام اعظم
 رحمۃ اللہ علیہ سے اس باب میں کچھ مخصوص نہیں اور وہ روایات جو کچھ
 امام صاحب سے آتی ہیں، شاذ ہیں۔ فتاویٰ رشیدیہ ص ۲۲

منکرین سماع کے امام اعظم اور سماع موتی

مولوی اسماعیل بن شاہ عبد الغنی بن شاہ ولی محدث دہلوی صراطِ مستقیم
 ص ۱۶۶ پر رقمطراز ہیں ترجمہ میدا احمد بریلوی کو سلسلہ چشتیہ کی نسبت حاصل
 ہونے کا بیان یہ ہے کہ ایک دن آپ حضرت خواجہ خواجگان خواجہ
 قطب الدین کاکی قدس سرہ کے مزار منور پر حاضر ہوئے اور مراقبہ کر کے
 بیٹھ گئے۔ اسی اشار میں حضرت خواجہ کی رُوح پر فتوح سے ملاقات ہوئی اور
 آنجناب نے سید صاحب پر بہت توجہ فرمائی اور اس توجہ کی وجہ سے
 نسبت چشتیہ کے ابتداء نصیب ہو گئی۔

جناب منشی محمد جعفر تھانی لکھتے ہیں: "ایک روز ارواحِ مقدس

فیصلہ تو حنفی حضرات ہی کریں جن کے لیے آپ کے اقوال بھی حجت ہیں۔ ہم نے
 تو محض تائید کے طور پر یہ روایت درج کی تھی اور اس کا حوالہ حاضر خدمت ہے۔
 دیکھیے (غرائب فی تحقیق المذاهب و تفہیم المسائل ص ۱۷۱ محمد بشیر الدین)

حیرت تو اس بات پر ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کی "مشہور" روایات جو سماع موتی کے
 حق میں ہوں وہ تو پیش نہیں کی جاتی اور جو روایات مشہور ہیں انھیں "شاذ" کہہ کر اپنے
 آپ کو مطمئن کر لیا جاتا ہے۔ کیا تحقیق کا یہی انداز ہوتا ہے؟ سماع موتی کے رد میں

ہدایہ کی یہ عبارت بھی قابل غور ہے:

وَكذلكَ الْكَلَامُ وَالذُّخُولُ لِأَنَّ الْمَقْصُودَ مِنَ

الْكَلَامِ الْإِفْهَامُ وَالْمَوْتُ يُسَافِرُهُ (هدایۃ ج ۱ ص ۳۸۲)

یعنی "اسی طرح اگر کسی نے یہ قسم کھائی کہ میں تم سے نہ کلام کروں گا
 نہ تمہارے پاس آؤں گا۔ پھر مرنے کے بعد اس کی قبر کی زیارت کی

جناب غوث الثقلین سید عبد القادر جیلانی و حضرت بہاؤ الدین نقشبند
متوجہ حال سید صاحب ہوں اور قریباً ایک ماہ تک کسی قدر تنازعہ ان
دونوں روحوں کے درمیان رہا ہر ایک روح ان دونوں روحوں میں سے
سید صاحب کو اپنی طرف جذب کرنا چاہتی تھی۔ آخر بعد انقضائے ایام
تنازعہ کے دونوں روحوں کی بالاشترک جذب کرنے پر صلح ہو گئی۔ تب
دونوں ارواح مقدرہ نے بالاشترک آپ پر جلوہ گر ہو کر ایک ہر تک بہ نفس
نفس محو توجہ قوی اور تاثیر زود آور فرمائی کہ اس ایک ہر میں نسبت ان دونوں
خاندانوں کی آپ کو حاصل ہو گئی۔ سوانح احمدی ۶۵-۶۴

یہ روایت صراط مستقیم میں بھی درج ہے۔

اب یہ معنی تو کیلانی صاحب ہی حل فرمائیں گے کہ کیا سید صاحب پر
توجہ ڈالنا اتنا ہی ضروری تھا کہ ان دونوں بزرگوں کے ارواح قدست اسراریم
علیہم اور اعلیٰ علیہم کی نعمتیں اور بلند مقام چھوڑ کر ایک ماہ تک آپس میں
جھگڑتی رہیں۔

کیا کیلانی صاحب یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ اگر امتوات غیر احیاء
اور وہم عن دعائہم خفیون کا اطلاق صرف فوت شدہ بزرگوں پر
ہی ہوتا ہے تو سید احمد بریلوی مزار خواجہ قطب الدین علیہ الرحمۃ پر کیا لینے

یا کلام کیا تو قسم نہ ٹوٹے گی کیونکہ کلام سے مقصود سمجھانا ہوتا ہے اور
موت اس (انہام) سے روک دیتی ہے!

۵۳ معنی کس کے لیے؟

جو حضرات عالم بھی ہوں اور طریقت و سلوک میں بھی ان کا دامن اُلجھا
ہوا ہو، ان کے ذہنی انتشار کی بھی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب
محدث دہلوی، سید اسماعیل شہید، ابن حجر مکی وغیرہم سب اسی قبیل سے
ہیں۔ اب ایک طرف شاہ ولی اللہ کی کتاب "البلد المبین" دیکھیے۔ اور
دوسری طرف "انفاس العارفين" اسی طرح شاہ اسماعیل کی کتاب "تقویۃ الایمان"
دیکھیے پھر صراط مستقیم، آپ کو یہ یقین ہی نہ آئے گا کہ یہ ہر دو کتب ایک ہی

کہتے تھے۔ اگر پکارنے والے کی پکار کی خبر نہیں ہوتی تو وہاں سید صاحب کی ملاقات کس سے ہوتی تھی۔ اگر انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے تو شاہ نقشبند کو بخارا میں اور شاہ جیلان کو بغداد میں کیسے خبر ہوتی کہ ہندوستان میں کوئی سید احمد بریلوی نامی بھی شخص ہے چل کر اس پر توجہ ڈالی جائے جس کی تشہیر بزم خود توحید پرستوں کے امام ازل مولوی اسماعیل صاحب دہلوی نے صراطِ مستقیم میں کی ہے۔

آخر میں میں امید کرتا ہوں کہ ادارہ محدث جو کہ کتاب و سنت کی روشنی میں آزادانہ بحث و تحقیق کا حامی ہے تصویر کا دوسرا نسخہ شائع کرنے کی زحمت گوارا کرے گا تاکہ "محدث" کا مطالعہ کرنے والے حق و باطل کو

خود پرکھ سکیں۔

مخلص: چوہدری محمد علی حنفی

مصنف کی لکھی ہوئی ہیں۔ دونوں کتابوں میں ایک دوسری کا مکمل رد و وجود ہوتا ہے۔ اگر آپ نے صراطِ مستقیم ملاحظہ فرماتی ہے تو تقویۃ الایمان بھی دیکھ لیجئے۔ ہمارے لیے ان کتابوں میں سے کوئی کتاب بھی حجت کی حیثیت نہیں رکھتی۔ ان کو بھی پرکھنے کا معیار یہی ہے کہ انہیں کتاب و سنت پر پیش کیا جائے اور "حَدِّ مَا صَفَا وَرَدَعَ مَا كَذَرَ" کے اصول پر عمل کیا جائے۔

رہی یہ بات کہ سید احمد شہید کو چشتیہ نسبت کیسے حاصل ہوئی اذکاراً کیسے؟ آخر سید احمد میں کونسی خوبی تھی کہ بغداد سے پیران پیر کی رُوح توجہ ڈالنے کے لیے آگئی اور دوسری طرف سے قطب الدین بختیار کاظمی کی رُوح تشریف لائی، پھر ان رُوحوں میں ایک ماہ تک تنازعہ ہوتا رہا۔ بالآخر سمجھوتہ کی صورت میں صلح ہو گئی اور سید احمد کو دونوں نسبتیں حاصل ہو گئیں۔ وغیرہ وغیرہ..... اگر ہم ان واقعات کو درست سمجھتے ہوں تو پھر تو معتمہ بھی سمجھیں ورنہ یہ معتمہ کیسا اور ان کو حل کرنے کے ہم مکلف کیونکر؟ ایسے حشمتی واقعات حالات کی حیثیت خواب کی سی ہوتی ہے جنہیں اہل طریقت و سلوک خود بھی حجت تسلیم نہیں کرتے!

(عبدالرحمن کیلانی)

